معیار: علمی وتحقیقی مجلّہ ,شعبۂ اُردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، جلد: ۱، شمارہ: ۱، جنوری -جون ۲۰۰۹ء

جنوبی ایشیا میں انگریزی زبان کی ترویج: علماء کا ردِّعمل

محمد ارشد*

ستمبر ۱۸۰۳ء میں جنرل لارڈ لیک (Lord Lake) کی قیادت میں انگریزی فوج کے دارالسّلطنت دہلی میں فاتحانہ داخلہ کے ساتھ ہی کلکتہ سے دہلی تک ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار قائم ہوگیا۔ اس بیرونی اقتدار نے یوں تو برّعظیم پاک و ہند کی اجتماعی زندگی کے سب ہی شعبوں پر اثر ڈالا لیکن روایتی تہذیب و تمدن کے تین عناصر: ۱-قانونی و عدالتی نظام، ۲-تعلیمی نظام اور ۳-فکری و اعتقادی نظام، خاص طور سے متاثر ہوئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکام چونکہ ایک خاص تہذیب اور زبان کے نمائندے تھے چنانچہ ان کے اقتدار کے قیام و استحکام کے ساتھ ساتھ اُن کی تہذیب اور قومی زبان-انگریزی- کا غلبہ و استیلاء بھی ناگزیر تھا۔

گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز (Warren Hastings، ۱۷۷۲-۱۷۸۵ء) اور اُس کے جانشین کارن والیز (Cornwallies، ۱۷۸۶-۱۷۹۸ء) نے قدیم عدالتی نظام کی ازسرِ نوتنظیم وتشکیل کی طرف خاص توجہ دی۔ چنانچہ ان دونوں کے ادوار میں فوجداری اور دیوانی کی عدالتوں کی تنظیم نو کی گئی۔ متعدد نئی عدالتیں قائم ہوئیں جن کے عہدے انگریزوں کے لیے مختص کردیے گئے، جبکہ مسلمان قاضیوں کے دائرہ عمل کو محدود سے محدود تر کردیا گیا۔ اب ضلعی دیوانی عدالتوں کی صدارت انگریز کلکٹر مسلمان مفتیوں اور ہندو پنڈتوں کے تعاون سے کرنے لگے۔ یہ عدالتیں مسلمانوں کے شخصی و عائلی قوانین سے متعلق مقدّمات کے فیصلے شرعی قانون کے مطابق کرتی تھیں [۱]۔ کارن والیز کے دور میں اسلامی قانون سے نابلد انگریز ججوں اور قانونی افسروں کی سہولت کے لیے حنفی فقہ کی مشہور کتاب ہدایہ کا انگریزی میں ترجمہ کراکے شائع کیا گیا [۲]۔ سرولیم جونز (Sir William Jones) بانی ایشیاٹک سوسائٹی بنگال (تأسیس ۱۷۹۴ء) نے قانونِ وراثت سے متعلق فقہِ حنفی کی کتاب سراجیہ کا ترجمہ کرنے کے علاوہ انگریزی میں اُس کی شرح بھی لکھی [۳]۔

کمپنی نے اٹھارہویں صدی کے اواخر سے برطانوی دیوانی و فوجداری قوانین کے اجراء و نفاذ کا آغاز کیا ۔ نئے فوجداری قوانین کے نفاذ سے اسلام کے قانون فوجداری کی کارفرمائی متاثر و محدود ہوئی۔ کمپنی کی ان قانونی اصلاحات کے نتیجے میں نظامِ قانون کا انداز انگریزی ہوگیا اور گورنر جنرل کی مرکزی حکومت کی تولیّت میں آ گیا [۴]۔ سب سے اہم یہ کہ مسلمانوں

* مدیر، اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی (علاّمہ اقبال کیمپس)، لاہور-۵۴۰۰۰۔

پر اعلیٰ قانونی و عدالتی عہدوں کے دروازے، انگریزی زبان اور جدید قانون سے عدم واقفیت کے سبب، بند ہوگئے۔

کمپنی کی حکومت نے ابتدائی چارعشروں (۱۷۷۲-۱۸۱۳ء) تک اس ملک میں جدید مغربی تعلیم اور انگریزی زبان کی ترویج نیز جدید اسکولوں اور کالجوں کے قیام کی طرف کوئی توجہ نہ تھی۔ اس کے بجائے اس نے مشرقی علوم و السنہ کی سرپرستی کی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے پہلے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز نے فارسی زبان کو بطورِ دفتری برقرار رکھا۔ مزید برآں اُس نے عدالتی و انتظامی ضروریات کے پیش نظر عربی و فارسی زبانوں اور اسلامی قوانین میں ماہر علماء کی تیاری کے لیے ۱۷۸۱ء میں کلکتہ مدرسہ (مدرسۂ عالیہ) قائم کیا۔ وارن ہیسٹنگز ہندوستان میں عرصے سے مقیم تھا۔ وہ فارسی زبان پر پورا عبور رکھتا تھا اور مشرقی علوم والسنہ کا بڑا شیفتہ و دلدادہ تھا، چنانچہ وہ مشرقی علوم و فنون کا سرپرست بن گیا۔ اُن دنوں اتفاق سے کمپنی کے اعلیٰ عہدیداروں میں بھی ایک حلقہ ایسا تھا جو وارن ہیسٹنگز کے خیالات سے اتفاق کرتا تھا اور مشرقی علوم اور زبانوں سے گہری دلچسپی رکھتا تھا مثلاً سرولیم جونز (Sir William Jones)، جج عدالتِ عالیہ کلکتہ، سرچارلس وِل کِنس، نیتھانیل ہال ہیڈ، سرجان شور جو بعد میں گورنر جنرل ہوا، فرانسس گلیڈون، جان کارناک، جو ناتھن ڈن کن اور ولیم چیمبرلیس وغیرہ۔ سرولیم جونز ۱۷۸۳ء میں عدالتِ عالیہ کا جج ہوکر کلکتہ آیا۔ وہ عبرانی، یونانی، لاطینی عربی، فارسی، فرانسیسی، ہسپانوی، اطالوی، جرمنی، ترکی، چینی اور سنسکرت زبانوں میں مہارت رکھتا تھا۔ ولیم جونز نے برّعظیم پاک و ہند پہنچ کر پہلے ہی سال بنگال میں ایشاٹک سوسائٹی آف بنگال (Asiatic Society of Bengal) کی اس غرض سے بنیاد ڈالی کہ ایشیا کی تاریخ، علومِ طبعی، آثارِ قدیمہ، فنونِ لطیفہ و دیگر علوم اور فنون و ادب کے متعلق تحقیقات کی جائے [۵]۔ غرضیکہ وارن ہیسٹنگز، سرولیم جونز اور کمپنی کے بیش تر حکام اسی مشرق زدہ ذہنیت کے مالک تھے۔ اٹھارہویں صدی میں کمپنی کی انتظامی پالیسی پر انہی عناصر کا غلبہ تھا۔

جدید تعلیم، انگریزی زبان کی ترویج اور مسلمانوں کا رویّہ:

کمپنی کی حکومت کے ابتدائی سالوں ہی میں وارن ہیسٹنگز اور ان کے ہم خیال ''مستشرقین'' کے مقابلے میں کمپنی کے حکام میں ایک حلقہ ان افراد کا بھی تھا جن میں چارلس گرانٹ (۱۷۴۶-۱۸۲۳ء) وغیرہ پیش پیش تھے جو ہندوستان کو انگریزی زبان و ادب اور ولایتی تہذیب کے ذریعے ''مہذّب'' بنانے پر مُصر تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ یہاں برطانوی قوانین نافذ ہوں، یہاں کی سرکاری زبان انگریزی کردی جائے اور اسکولوں اور کالجوں میں انگریزی تعلیم دی جائے۔ ان کی رائے یہ تھی کہ حکومت کی طرف سے سنسکرت یا عربی میں غیر عیسائی مذہبی تعلیم کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی نہ ہونی چاہیے۔ اس ملک کی سماجی برائیوں اور اخلاقی خرابیوں کا علاج اور بڑے پیمانے پر پھیلی ہوئی جہالت و لاعلمی کا سدّباب جدید انگریزی تعلیم کی ترویج و اشاعت ہی سے کیا جاسکتا ہے [۶]۔ انگریزی مسیحی پادری اور مبلّغ انگریزی بھی زبان و ادب اور جدید تعلیم کی اشاعت کے پرجوش حامی تھے۔ وہ ہندوستانیوں کو مہذب بنانے اور مسیحیت کی تبلیغ و اشاعت کے لیے اس ملک میں جدید تعلیم خصوصاً انگریزی زبان کی ترویج کو بہت اہم خیال کرتے تھے۔ چارلس گرانٹ نے عیسائی مبشّرین کی تبشیری سرگرمیوں

کی بھی بڑے زور سے تائید کی [8]۔ تاہم ابتدائی دور میں کمپنی کی حکومت سیاسی و انتظامی مصالح کے پیش نظر اس کے حق میں نہ تھی۔ ۱۸۱۳ء سے قبل کمپنی حکام نے مسیحی مشنوں کے قیام اور تبلیغی سرگرمیوں کی سرپرستی و پشت پناہی سے بھی گریز کیا [8]۔ بایں ہمہ انگلستان میں مسیحی مشنریوں کے دباؤ اور تحریک پر ۱۸۱۳ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے نئے چارٹر ایکٹ کی منظوری دی۔ اس ایکٹ کے رُو سے کمپنی کی حکومت کو پابند کیا گیا کہ مقبوضہ ملک کی آمدنی کا کچھ حصہ (کم از کم ایک لاکھ روپیہ سالانہ) علم و ادب کے احیاء اور ترقی، ہندوستانی اہلِ علم کی حوصلہ افزائی اور برطانوی مقبوضات کے باشندوں میں انگریزی زبان اور سائنس کی تعلیم کی ترویج و ترقی میں صرف کیا جائے [9]۔ اس ایکٹ کے اجراء کے ساتھ ہی مسیحی مبشّرین کو برّعظیم پاک و ہند میں تبلیغی و تعلیمی سرگرمیوں کی اجازت حاصل ہوگئی [10] چنانچہ مسیحی پادریوں اور منّادوں نے مسیحیت کی تبلیغ و اشاعت کے لیے بمبئی، مدراس اور بنگال کے کے علاوہ ملک کے دوسرے حصوں میں جگہ جگہ تبلیغی مشن قائم کیے، اسکول اور کالج کھولے۔ ان اسکولوں اور کالجوں کے نام پر مسیحی مبشّرین کو مسیحیت کے لیے کام کرنے میں بڑی مدد ملی۔ پادری ان اسکولوں اور کالجوں میں انگریزی زبان اور مغربی علوم کی تعلیم و تدریس کے ساتھ ساتھ مسیحیت کا پرچار بھی کرتے تھے اور طلبہ کو اپنا قدیم مذہب ترک کرکے حلقۂ بگوش مسیحیت ہونے کی ترغیب دیتے تھے۔ مشن اسکولوں میں بائبل کی کلاسوں میں حاضری لازمی تھی اور بچوں سے امتحان عیسائی مذہبی کتابوں سے بھی لیا جاتا تھا [11]۔ مسیحی مبلغّوں نے اپنے عزائم کو پردۂ راز میں نہیں رکھا انہوں نے ببانگ دہل یہ اعلان کردیا تھا کہ انگریزی زبان اور مغربی تعلیم کی اشاعت کے نتیجے میں دیسی مذاہب (اسلام اور ہندومت) کی عمارتیں مسمار ہوجائیں گی [12]۔ چنانچہ اس دور میں بالعموم یہ خیال کیا جاتا تھا کہ بچے انگریزی پڑھنے کے بعد اپنے دین سے بیزار ہوجاتے ہیں اور مسیحیت اختیار کرلیتے ہیں۔ اس لیے مسلمانوں نے مشن اسکولوں میں اپنے بچوں کا پڑھنا یا انگریزی سیکھنا گوارا نہیں کیا، بلکہ انگریزی پڑھنے کی سخت مخالفت کی اور مشن اسکولوں کی تعلیم مسترد کردی [13]۔

مسیحی مبشّرین کے قائم کردہ تعلیمی اداروں کے علاوہ ۱۸۳۳ء کے چارٹر ایکٹ کے بعد خود حکومت کی طرف سے قائم کردہ مجلسِ تعلیماتِ عامہ کے صدر لارڈ میکالے (Macaulay) نے فروری ۱۹۳۵ء میں حکومت کو جو لائحہ عمل تجویز کیا اس نظام تعلیم میں ایک نہایت انقلابی تبدیلی کی بنیاد فراہم کی۔ میکالے ایک طرف مشرقی علوم کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا اور دوسری جانب اہل ہند کو جہالت اور توہم پرستی سے نکال کر اس چیز کی برکات سے فائدہ پہنچانے پر آمادہ و کوشاں تھا جسے وہ اپنی اعلیٰ و برتر تہذیب سمجھتا تھا، چنانچہ اس نے حکومت کو مشرقی علوم کی سرپرستی کو کلیتًا ترک کرکے اہل ہند کو انگریزی کے ذریعے جدید مغربی علوم کی تعلیم دینے کی سفارش پُرزور انداز میں کی [14]۔ میکالے کی اس تجویز پر عمل درآمد کے طور پر مارچ ۱۸۳۵ء میں گورنر جنرل لارڈ ولیم بینٹنک (William Bentinck، ۱۸۲۸-۱۸۳۵ء) نے ایک قرارداد جاری کی جس میں یہ طے کردیا گیا کہ حکومت برطانیہ کا بڑا مقصد اہلِ ہند کے اندر یورپین لٹریچر اور سائنس کی اشاعت کرنا ہے، چنانچہ

جس قدر رقم مقاصدِ تعلیم کے لیے مختص کی گئی ہے وہ صرف انگریزی تعلیم پر صرف ہونی چاہیے۔ آئندہ سرکاری روپیہ صرف انگریزی تعلیم (انگریزی زبان کے ذریعے انگریزی ادب اور سائنس کی تعلیم) پر خرچ کیا جائے گا۔ مشرقی درس گاہوں میں زیرِ تعلیم طلباء کی مالی امداد نہ کی جائے گی [15]۔ جس نظام تعلیم کی ترویج کا بیڑا اٹھایا، اُس میں انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا تھا، چنانچہ مسلمانوں خصوصاً اُن کے علماء نے اُن کو بھی شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھا اور مخالفانہ رویّہ اختیار کیا۔ کمپنی کی حکومت نے ۱۸۳۵ء کی تعلیمی قرارداد میں انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دیا۔ اس قرار داد میں یہ طے کر دیا گیا کہ حکومت برطانیہ کا بڑا مقصد اہل ہند کے اندر یورپین لٹریچر اور سائنس کی اشاعت کرنا ہے۔ چنانچہ جس قدر رقم مقاصد تعلیم کے لیے مختص کی گئی ہے وہ صرف انگریزی تعلیم پر صرف ہونی چاہیے۔ آئندہ تمام رقومات دیسی لوگوں میں انگریزی زبان کے ذریعے علم و ادب اور سائنس کی اشاعت پر صرف کی جائیں۔ اس قرار داد کی رو سے مسلمان طلباء کو تعلیمی وظائف کا سلسلہ موقوف کر دیا گیا [16]۔ ۱۹۳۵ء کی تعلیمی قرار داد نے تعلیم کا رخ قدیم مشرقی علوم سے موڑ کر مغربی علوم کی طرف پھیر دیا۔ ساتھ ہی مشرقی زبانوں پر بھی خط تنسیخ پھیر دیا گیا جس سے مسلمانوں میں شدید ہیجان اور اضطراب پیدا ہوا۔ سید احمد خاں کے سوانح نگار الطاف حسین حالؔی نے لکھا ہے کہ ''۱۸۳۵ء میں کلکتہ کے مسلمانوں نے جس وقت یہ سنا کہ گورنمنٹ تمام ہندوستان میں انگریزی تعلیم پھیلانا چاہتی ہے تو اُنہوں نے ایک عرضی تیار کی جس پر آٹھ ہزار مسلمان رئیسوں اور عالموں کے دستخط تھے اور جس کا ماحصل یہ تھا کہ گورنمنٹ کا انگریزی تعلیم پر اس قدر توجہ کرنا صاف دلالت کرتا ہے کہ اُس کا ارادہ ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کا ہے'' [17]۔ مسلمانوں کے یہ خدشات کچھ بے بنیاد بھی نہ تھے۔ لارڈ میکالے (Macaulay, Thomas Rabbington) نے جو نظام تعلیم ترتیب دیا تھا (۱۸۳۵ء) اُس کا مدّعا و مقصد ایک ایسے طبقہ کی تخلیق تھا جو رنگ و خون کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق و میلان، رائے، زبان و اخلاق اور عقل و فکر کے اعتبار سے برطانوی [مغربی] ہو [18]۔ میکالے کے تجویز کردہ اس نظامِ تعلیم میں مسیحی تبشیری روح بھی پوری طرح سے سموئی ہوئی تھی۔ چنانچہ میکالے اور اُس کے ہم خیال انگریز حکام کو یقین تھا کہ انگریزی تعلیم پانے والے ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایسی قلب ماہیت ہوجائے گی کہ وہ کبھی بھی اپنے قدیم مذاہب پر خلوصِ دل سے قائم نہیں رہ سکیں گے [19]۔ یہ نظام تعلیم اپنی روح، مقاصد اور نتائج و اثرات کے اعتبار سے مسلمانوں کے لیے زہرِ مہلک کی حیثیت رکھتا تھا، اس امر کا اعتراف خود انگریز حکام نے بھی کیا ۔ ۱۸۷۱ء/۱۸۷۲ء میں ڈبلیوڈبلیو ھنٹر نے انگریزی تعلیم کے نتائج و اثرات کے بارے میں لکھا کہ ''ہمارا نظام تعلیم، جس نے ہندوؤں کو اُن کی صدیوں کی نیند سے جگایا اور اُن کے کاہل عوام میں قومیت کے شریف جذبات پیدا کردیے ہیں، مسلمانوں کی روایات کے بالکل خلاف اور اُن کی ضروریات کے بالکل غیرمطابق بلکہ ان کے مذہب کی تحقیر کرتا ہے [20]۔ ہمارے اینگلوانڈین سکولوں سے کوئی نوجوان خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان ایسا نہیں نکلتا جو اپنے آباء و اجداد کے مذہب سے انکار کرنا نہ جانتا ہو۔ ایشیا کے پھلنے پھولنے والے مذاہب جب مغربی سائنس کے یخ بستہ حقائق کے مقابلہ میں آئے ہیں تو سوکھ کر لکڑی ہوجاتے ہیں۔ ان بے دینوں کی بڑھتی ہوئی نسل کے

علاوہ ہم کو عافیت پسند طبقہ کی امداد حاصل ہے'' [۲۱]۔ انگریزی تعلیم نے برّعظیم پاک و ہند کی نئی نسل کے ذہن و خیال پر گہرے اثرات مرتب کیے اور ان کا اپنے قدیم مذاہب اور تہذیبی و معاشرتی اور اخلاقی اقدار سے ربط وتعلق کمزور پڑتا گیا حتیٰ کہ جدید تعلیمی اداروں میں تبدیلی مذہب کے واقعات پیش آنے لگے۔ ۱۸۵۲ء میں آگرہ اور خصوصاً دہلی کالج کے متعدد ہندو اساتذہ اور طلباء کے قبولِ مسیحیت کے واقعہ نے ایک بحران کی صورت اختیار کرلی۔ اِکا دُکا مسلمان بھی اپنے قدیم مذہب سے برگشتہ ہوکر حلقۂ بگوشِ مسیحیت ہوئے۔ اس امر نے دہلی اور آگرہ کے مسلمان علماء کو سخت تشویش اور اضطراب سے دوچار کیا [۲۲] غرضیکہ انگریزی تعلیم نئی نسل کے ذہنی و فکری ارتداد کا ایک مؤثر محرّک بن گئی [۲۳]۔ مسیحی مبشرین، حکام اور ان کے بہی خواہوں کو یقین تھا کہ انگریزی نظامِ تعلیم کے نتیجے میں اس ملک کی نئی نسل کی بڑی تعداد اپنے قدیم مذاہب کو خیرباد کہہ کر عیسائیت کو اختیار کرے گی۔ فرانسیسی مستشرق گارسان دُتاسی نے، جسے مسیحی تبشیری سرگرمیوں سے بڑی ہمدردی رہی، اپنے خطبات میں پاک و ہند میں انگریزی تعلیم کے امید افزا اثرات و نتائج کا اظہار ان الفاظ میں کیا (مئی ۱۸۵۹ء):

''انگریزی حکومت [تعلیم] سے لازماً ہندوستانی ادب پر قوی اثر پڑے گا۔ وہ صورت بدل کر آدھا تیتر اور آدھا بٹیر ہوجائے گا یعنی آدھا ہندوستانی اور آدھا انگریزی۔ انگریزی ترجمے اور انگریزی تقلید کی کثرت ہوجائے گی۔ بہت سے ہندوستانی عیسائی ہوجائیں گے اور اُن کا خاص ہندی عیسائی ادب ہوگا'' [۲۴]۔

موصوف نے اپنے ایک دوسرے خطبہ میں (دسمبر ۱۸۶۳ء) میں کہا:

ہندوستان میں یورپین علوم کا جس قدر چرچا بڑھتا جاتا ہے اسی قدر وہ ہمارے تہذیب و تمدن اور ہمارے اُصول مذہبی سے قریب ہوتے جاتے ہیں۔ یہ مذہبی اصول [مسیحیت] ہی ہمارے تہذیب و تمدن کا مآخذ ہیں۔ ہندوستان میں تبلیغ مسیحیت کو جو کامیابی ہورہی ہے اس میں شبہہ کی گنجائش نہیں اور اس سے ہر عیسائی کو خوش ہونا چاہیے [۲۵]۔

غرضیکہ انگریزی تعلیم اور عیسائیت کی تبلیغ دونوں لازم و ملزوم ہوگئے تھے چنانچہ اس تعلیم سے مسلمانوں کی مغایرت ایک فطری امر تھا۔ سرسید احمد خان جو ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں میں انگریزی زبان و ادب اور جدید علوم کی اشاعت کے سب سے بڑے داعی اور محرّک بن کر سامنے آئے، انگریزی تعلیم کے بارے میں مسلمانوں کی نفرت و بے زاری کے اسباب و محرّکات کے بارے میں یہ لکھنے پر مجبور ہوئے:

''مسلمانوں کا یہ خیال عام تھا کہ انگریز آہستہ آہستہ انہیں عیسائی بنانا چاہتے ہیں اور ان کے اس شبہ کے لیے نہایت قوی بنیادیں موجود تھیں۔ یہ درست ہے کہ انگریزوں نے اپنے ابتدائی زمانے میں اس طرح کی مداخلت کا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا لیکن آہستہ آہستہ عیسائی مبلغین، پادری اور مشنری عیسائیت کی تبلیغ کے لیے مامور ہوئے اور انگریزی حکومت کی انہیں حمایت حاصل ہوئی [۲۶]..... جدید تعلیم سے لوگ یوں ہی متنفر تھے کہ مشنری اسکول جاری ہوئے اور ان میں مذہبی تعلیم شروع ہوئی۔ ہندو اور مسلمان بچوں کو جو ان مدرسوں میں داخل ہوتے تھے عیسائیوں کے عقائد کی تعلیم دی جاتی تھی۔ سرکار

کی طرف سے دیہاتی مکاتب قائم ہوئے تو لوگ یقین سمجھتے تھے کہ صرف عیسائی بنانے کو یہ مکتب جاری ہوئے ہیں۔ عامۃ النّاس یوں خیال کرتے تھے کہ یہ عیسائی مکتب ہیں اور کرسٹان [Christian] بنانے کو بٹھاتے ہیں۔ ہمارے لڑکے ان میں پڑھ کر اپنے مذہب کے احکام اور مسائل اور اعتقادات اور رسمیات سے بالکل ناواقف ہوجائیں گے۔'' [۲۷]

یوں تو کمپنی کی حکومت کے قیام کے بعد مسلمانوں کے لیے ملازمتوں کے مواقع محدود ہوہی گئے تھے لیکن ۱۸۳۵ء میں عدالتوں اور سرکاری دفاتر میں فارسی کے بجائے انگریزی کو سرکاری زبان کی حیثیت سے اختیار کیے جانے پر بہت سے مسلمان جو معتدبہ قابلیت رکھتے تھے ملازمتوں سے یکا یک محروم ہوگئے۔ مسلمان انگریزی زبان سے عدم واقفیت کی بناء پر سرکاری محکموں میں چپڑاسی دفتری جیسی معمولی نوعیت کی ملازمتوں کے علاوہ دیگر تمام عہدوں کے لیے نااہل قرار پائے، جس سے ان کی معاشی حالت مزید ابتر ہوگئی [۲۸]۔ ان حالات میں سرکاری ملازمتوں کے آرزو مند مسلمانوں کے لیے انگریزی زبان سے واقفیت اور جدید تعلیم کا حصول ناگزیر ضرورت کی حیثیت اختیار کرگیا۔ مسلمان بحیثیت مجموعی اب زیادہ دنوں تک جدید تعلیم سے بے اعتنائی کے متحمل نہیں ہوسکتے تھے۔

انگریزی زبان کے بارے میں علماء کا ردِّعمل ۱۸۵۷ء سے پہلے:

شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی (۱۷۴۶-۱۸۲۴ء) برّعظیم پاک و ہند کے وہ پہلے عالم و فقیہ اور سیاسی مفکّر تھے جنھوں نے انگریزی زبان کی تحصیل کے جواز میں فتویٰ دیا۔ بنگال، بہار اور اڑیسہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے قیام (۱۷۷۲ء) کے بعد جب سرکاری دفاتر اور عدالتوں میں فارسی انگریزی نے لینا شروع کی خصوصاً ۱۸۱۳ء کے چارٹر ایکٹ کے اجراء کے بعد جب ملک کے طول و عرض میں مسیحی مبشّرین نے اسکول و کالج قائم کیے تو انھوں نے انگریزی زبان کی تحصیل و تعلیم سے متعلق رہنمائی کے لیے شاہ عبدالعزیز دہلوی سے رجوع کیا۔ شاہ صاحب نے ایک فتویٰ میں انگریزی یا کسی اور زبان کا سیکھنا یا کسی شعبۂ علم کو حاصل کرنا جائز قرار دیا بشرطیکہ اُس کا مفید اور جائز استعمال مقصود ہو [۲۹]۔ شاہ صاحب سے جب اُن کے متبعین نے یہ سوال کیا کہ کیا ''انگریزی کا پڑھنا جائز ہے؟'' تو انہوں نے فرمایا:

''انگریزی کو اس لیے پڑھنا کہ انسان کتابیں پڑھ سکے، خط لکھ سکے اور الفاظ کے مخفی معنوں کو معلوم کرسکے، جائز ہے کیونکہ حضرت زید ابن ثابتؓ نے رسول کریمؐ کے حکم سے یہود اور نصاریٰ کی زبان اور لُغت پڑھی تھی تاکہ وہ اُن خطوط کا جواب لکھ سکیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہود اور نصاریٰ کی طرف سے آتے تھے۔ لیکن اگر کوئی شخص انگریزی زبان کو اس لیے پڑھتا ہے کہ اُس سے عیش وعشرت حاصل ہو یا انگریزوں کا تقرّب اور خوش نودی حاصل ہو تو یہ حرمت و کراہت میں داخل ہے'' [۳۰]۔

اس فتویٰ سے مترشح ہوتا ہے کہ شاہ عبدالعزیز لکھنے پڑھنے کی غرض سے انگریزی زبان کے سیکھنے کو جائز البتہ انگریزوں کی قربت یا ان کی ملازمت کی غرض سے اس کی تحصیل کو ناپسندیدہ و حرام خیال کرتے تھے [۳۱]۔ شاہ عبدالعزیز کے فتاوٰی اور ملفوظات سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کے انگریز حکام شاہ صاحب کے ہاں حاضر ہوتے اور اسلام کے بارے میں اُن سے

معلومات حاصل کرتے رہے [۳۲]۔ دہلی کا مٹکاف خاندان جو دہلی کے علمی اور انتظامی امور میں بہت اہمیت رکھتا تھا۔ شاہ صاحب کا عقیدت مند تھا [۳۳]۔ متعدد دیگر حکام بھی شاہ صاحب کی صحبت میں رہے۔ چند ایک نے اُن سے کچھ پڑھا بھی تھا [۳۴]۔ انگریزوں سے روابط کے سبب سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ شاہ صاحب کو انگریزی میں شُدبُد پیدا ہوگئی ہوگی۔ البتہ شاہ عبدالعزیز دہلوی نے خود عبرانی زبان کے ایک فاضل سے، جو اُن کے زمانہ میں دہلی آ گیا تھا، عبرانی زبان سیکھی تھی اور براہ راست عبرانی زبان ہی میں توریت اُس فاضل سے پڑھی، حالانکہ عمر بھی کافی ہوچکی تھی [۳۵]۔

البتہ انگریزی زبان کی تحصیل کے بارے میں شاہ عبدالعزیز کے مذکورہ فتویٰ کی اشاعت کے باوجود مسلمانوں کا سوادِ اعظم انگریزی زبان اور جدید مغربی علوم کی تحصیل سے گریزاں ہی رہا۔ مسلمانوں نے جدید نظام تعلیم سے فائدہ اس لیے نہیں اٹھایا کہ وہ اسے اپنے مذہب اور تہذیب و معاشرت کے لیے خطرناک تصور کرتے تھے۔ سرسید احمد خان کے رفقاء میں سے مولوی نذیر احمد دہلوی (۱۸۳۰-۱۹۱۲ء) کو دہلی کالج کے شعبہ علومِ شرقیہ میں تعلیم کے دنوں (۱۸۴۶-۱۸۵۳ء) میں انگریزی کی اہمیت اور قدروقیمت کا شدید احساس پیدا ہوگیا تھا۔ انہوں نے انگریزی بھی پڑھنا چاہی اور اپنے والد مولوی سعادت علی، جو نہایت متدین اور متقی آدمی تھے، سے اجازت حاصل کرنے کے لیے پرنسپل کے ذریعے سفارش کرائی لیکن والد کے سخت انکار سے مجبور ہوگئے۔ مولوی نذیر احمد اپنے ایک خطبہ (لیکچر) میں کہتے ہیں: ''دہلی کالج کے پرنسپل نے ہر چند چاہا کہ میں انگریزی پڑھوں، والد مرحوم نے صاف کہہ دیا کہ مجھے اس کا مرجانا منظور، اس کا بھیک مانگنا قبول، مگر انگریزی پڑھانا گوارا نہیں'' [۳۶]۔ تاہم بعد میں انہیں ذاتی کوشش سے انگریزی میں مہارت حاصل کی۔

تحریک ردِّعیسائیت اور انگریزی زبان کے ماہر علماء ۱۸۵۷ء سے پہلے:

جیسا کہ سطورِ بالا میں ذکر کیا جاچکا ہے انیسویں صدی کے نصف اوّل میں ملک کے شہری اور دیہی علاقوں میں مسیحی سرگرمیوں کا جال پھیلانے کے لیے بہت بڑی تعداد میں مسیحی منّاد/ مبشّرین برّعظیم پاک و ہند آئے اور ان لوگوں نے محض اپنے مذہب کی خوبیاں بیان کرنے ہی پر اکتفا نہ کیا بلکہ بالعموم تمام ہندوستانی مذاہب اور بالخصوص اسلام اور پیغمبرِ اسلام کو ہدف بنایا، اسلامی تعلیمات اور تہذیب کی مذمت کی، منظّم اسکیم کے تحت ایسی کتابیں شائع کی گئیں جن میں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و تعلیمات کو مسخ کر کے پیش کیا گیا۔ یہ تنگ نظری غالباً مسیحی مبشّرین کے اس تصوّر پر مبنی تھی کہ اس وقت چونکہ مسلمان سیاسی زوال کے باعث پست ہمتی کا شکار تھے، لہٰذا مسیحیت کے ''مضبوط'' پہلو اجاگر کرنے اور اسلام اور پیغمبرِاسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ''کمزوریاں'' گنانے سے مسلمان اپنے مذہب کو خیرباد کہہ دیں گے اور حلقۂ مسیحیت میں داخل ہوجائیں گے اور انگریز ہندوستان پر بلاروک ٹوک حکمرانی کرسکیں گے [۳۷]۔

دریں حالات وہ علماء جو مسیحی مبشّرین اور پادریوں کے مقابلہ کے لیے میدان میں اترے تھے انہیں ردِّ عیسائیت کے لیے انگریزی اور دیگر مغربی زبانوں سے واقفیت کی ضرورت و اہمیت محسوس ہوئی۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی

(۱۲۳۳-۱۳۰۸ھ/ ۱۸۱۷- ۱۸۹۳ء) جب مسیحی مبشّرین کے مقابلہ کے لیے میدان میں اُترے تو اُنہیں اسلام مخالف خیالات نیز مسیحی و یہودی مقدس کتب کی تعلیمات سے راست طور پر آگاہی کے لیے ڈاکٹر محمد وزیر خان (م۱۸۷۱-۱۸۷۲ء) کی معاونت درکار ہوئی [۳۸]۔ ڈاکٹر وزیرخاں طب و جراحت کی جدید تعلیم کے سلسلہ میں کئی سال انگلستان میں گزار چکے تھے۔ انہوں نے ذاتی محنت سے انگریزی کے علاوہ لاطینی اور عبرانی زبانوں میں مہارت پیدا کی تھی اور عیسائیت و یہودیت کا اصلی ماخذ سے وسیع مطالعہ کیا تھا۔ ہندوستان واپسی پر وہ یہودیت و مسیحیت سے متعلق انگریزی یونانی اور عبرانی کتب کا ایک وقیع ذخیرہ ہمراہ لائے تھے۔ آگرہ میں قیام و ملازمت کے دوران میں وہ مسیحی مبشرین کے مقابلہ اور اسلام کی تائید ونُصرت اور اس کے دفاع میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ ڈاکٹر وزیرخان ہی کی دعوت وتحریک پر مولانا رحمت اللہ کیرانوی مطالعہ و تردید عیسائیت کی طرف راغب ہوئے [۳۹]۔ ڈاکٹر صاحب مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے علمی وتصنیفی کاموں میں اُن کے شریک و معاون تھے، دونوں نے آگرہ کے تاریخی مناظرہ (۱۸۵۴ء) میں حصہ لیا اور مغربی پادری کارل فانڈر (Carl Gottlieb Pfandar، ۱۸۰۳-۱۸۶۸ء) کو شکست فاش دی [۴۰]۔

امام فنِ مناظرہ مولانا سیّد ناصرالدین ابوالمنصور دہلوی(۱۸۲۳-۱۹۰۳ء)، جو عمر بھر ردّعیسائیت میں ہمہ تن تصنیف و تالیف نیز تبلیغِ اسلام میں مصروف رہے [۴۱]، عربی و فارسی کے علاوہ انگریزی سے بھی واقف تھے، نیز عبرانی و یونانی کے بھی ماہر تھے انہوں نے توریت اور عبرانی و یونانی زبانیں علمائے اہل کتاب سے پڑھیں [۴۲]۔

سید احمد خان اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ:

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی نے اس حقیقت کو الم نشرح کردیا تھا کہ مسلمانوں کے لیے برطانوی قوت و اقتدار کا خاتمہ اور مسلم اقتدار کا احیاء کسی طور سے ممکن نہیں رہا، اور لامحالہ طور پر اب ان کو اپنی معاشی، سماجی، تعلیمی اور سیاسی حالت کی اصلاح برطانوی اقتدار کے تحت زندگی گزارتے ہوئے کرنا ہوگی۔ لہٰذا اب ان کی معاشی اور سیاسی زندگی کی بہتری کا راستہ یہی ہے کہ وہ انگریزی زبان اور جدید تعلیم میں استعداد و لیاقت اعلیٰ درجہ کی پیدا کریں۔

سرسید احمد خان (۱۸۱۷-۱۸۹۸ء) نے، جو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد مسلمان کی حالتِ زار کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوتے تھے، اس حقیقت کو پالیا تھا کہ مسلمانوں کی پس ماندگی و بدحالی کا مداوا جدید تعلیم اور خصوصاً انگریزی زبان کی تحصیل کے بغیر کسی طور پر ممکن نہیں۔سرسید احمد خاں کی رائے یہ ٹھہری تھی کہ ''مسلمانوں کی سوشل اور پولٹیکل حالت درست کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اُن میں انگریزی تعلیم پھیلائی جائے۔ اس دریا کو طے کیے بغیر مسلمانوں کی بھلائی کی تدبیریں فضول اور بے کار ثابت ہوں گی'' [۴۳]۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کو انگریزی زبان و ادب اور جدید مغربی علوم کی تحصیل کی دعوت بڑے جوش و جذبے سے دی۔ وہ رسالہ تہذیب الاخلاق کے ذریعے لوگوں کو انگریزی تعلیم کی ضرورتیں ذہن نشین کراتے رہے [۴۴]۔ سرسید کا نظریہ یہ تھا کہ ''ہم [مسلمان] جو کچھ ترقی کرسکتے ہیں انگریزی

زبان کے ذریعے سے کرسکتے ہیں، کیونکہ ہماری حکمران زبان انگریزی ہے۔ اعلیٰ درجہ کی تعلیم صرف انگریزی ہی کے ذریعہ سے ہوسکتی ہے۔ کسی ملک نے کسی علم میں ترقی نہیں کی تاوقتیکہ وہ علم اُس زبان میں نہ آ گیا ہو جو اُس ملک پر حکمران ہے۔ ہندوستان میں جو زبان حکمران ہے انگریزی زبان ہے اس لیے اس ملک میں ورنیکلر زبان کے ذریعے کسی علم کو ترقی نہیں دی جاسکتی۔ تاریخ میں کوئی نظیر اس بات کی نہیں پائی جاتی کہ کسی ایسی زبان کی وساطت سے جو حکمران قوم کی زبان نہ ہو، کسی قوم میں کسی علم نے ترقی پائی ہو۔ اس لیے لازم ہوگیا ہے کہ ہم اسی زبان میں جدید علوم کو حاصل کریں'' [۴۵]۔

سرسید نے ببانگ دہل یہ اعلان کیا کہ:

''ہمیں اپنی قوم کو انگریزی زبان کی، جس کو خدا نے اپنی مرضی سے ہم پر حکومت دی ہے اور جس کو جانے بغیر دنیا کا کوئی کام نہیں کرسکتے بلکہ میں کہوں گا کہ دین کی بھی خدمت نہیں کرسکتے، تعلیم دینا ہے [۴۶]۔ ہم اپنی قوم کو سمجھاتے ہیں کہ اُن کا مقصد مغربی علوم و مغربی زبان کو اعلیٰ درجہ تک حاصل کرنا ہونا چاہیے [۴۷]۔ ہمارے لیے سیدھا راستہ کھلا ہوا ہے کہ جہاں تک ہم سے ہوسکے یورپین لٹریچر اور یورپین سائنس میں اعلیٰ درجہ کی ترقی کریں'' [۴۸]۔

غرضیکہ سرسید نے انگریزی زبان کی تحصیل اور جدید مغربی علوم کی تعلیم کی وکالت زور دار انداز میں کی۔ انہوں نے محض اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے لیے عملی اقدامات بھی کیے۔ اس سلسلہ کا اہم ترین اقدام علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم (۱۸۷۵ء) اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قیام تھا(۱۸۷۸ء)۔ سرسید کا بڑا مقصد اس کالج کے قائم کرنے سے یہی تھا کہ کسی طرح مسلمانوں کی حالت درست ہو اور وہ انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ ہوں [۴۹]۔ محمڈن کالج کی تعلیمی اسکیم میں انگریزی زبان و ادب کی تعلیم کو مرکزی حیثیت دی گئی، کیونکہ اس کے قیام کا بڑا مقصد ہی مسلمان طلباء میں انگریزی زبان کی اعلیٰ درجہ کی لیاقت و استعداد پیدا کرنا تھا [۵۰]۔ انگریزی زبان و ادب چونکہ یورپ کی تہذیب و معاشرت، اس کے اقدارِ حیات اور نظامِ افکار کی ترجمان تھی، چنانچہ اُس نے علی گڑھ میں زیرِتعلیم نوخیز نسل کے ذہنوں میں لادینیت (secularism) اور مغربیت/غرب زدگی (Westernization) کے رجحانات کی افزائش کی [۵۱]۔ پھر بانیٔ تحریک سرسید نے صرف اپنی فتح مند اور حاکم قوم کے علوم و زبان حاصل کرنے پر ہی زور نہیں دیا بلکہ اس قوم کی تہذیب و طرزِ معاشرت اور عادات و اطوار کی تقلید کی دعوت بھی بڑے جوش و جذبے سے دی۔ وہ اس سلسلہ میں اپنے ایک مضمون ''ورنیکلر یعنی ہماری زبان'' میں لکھتے ہیں:

''قومی ترقی اور حکومت دونوں ماں جائی بہنیں ہیں، جب کسی قوم میں حکومت نہ رہے تو اُس کی ترقی صرف اس بات پر منحصر ہے کہ وہ اپنی فتح مند قوم کے علوم و زبان حاصل کرنے سے اپنے فتح مندوں کے ساتھ ملکی حکومت میں حصہ لے، علوم کی اُن شاخوں میں اعلیٰ درجہ کی لیاقت حاصل کرے جن میں اُن فتح مندوں نے کاملیت حاصل کی ہے۔

سوشل عادات اور علمی و عملی و ملکی خیالات اُس قسم کے پیدا کرے جو فاتح و مفتوح میں کسی درجہ تک مناسبت پیدا کریں۔ جب تک فاتح و مفتوح میں اس قسم کی مناسبت پیدا نہ ہو اُس وقت تک باہمی دوستی کا برتاؤ محالات سے ہے۔ اسی مناسبت

کے نہ ہونے سے آج تک ہندوستان میں فاتح و مفتوح کے باہم دوستانہ برتاؤ نہیں ہے'' [۵۲]۔

سرسید نے کالج میں یورپین اسٹاف کے تقرر کا محرّک بھی یہی بتایا کہ وہ طلباء کو گورنمنٹ کا ادب اور انگریزوں کی محبت سکھائیں، انگلش فیشن کی محبت اور وقعت ان کے دل میں پیدا کریں۔ سرسید کا خیال یہ تھا کہ حاکم قوم کی تہذیب و طرزِ معاشرت اختیار کرنے سے حکام کی نظر میں مسلمانوں کی قدر و منزلت بڑھ جائے گی [۵۳]۔ چنانچہ سرسید کے دور میں اور اس کے بعد بھی انگریزی اسٹاف کو پالیسی سازی کے علاوہ کالج کی نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں بڑی اہم حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ انگریزی اسٹاف نے طلباء کو انگریزی زبان و ادب کے علاوہ مغربی تہذیب و معاشرت اور افکار و خیالات کا شیفتہ و دلدادہ بنانے میں اہم کردار ادا کیا [۵۴]۔ چنانچہ اس دور میں طلباء کا طرزِفکر خالصتاً مغربی ہوگیا۔ انگریزی تعلیم کی تحصیل اور مغربی تہذیب و طرزِ معاشرت کی تقلید کے بارے میں سرسید احمد خان کے طرزِ فکر وعمل اور اُس کے اثرات و نتائج کے بارے میں سید ابوالحسن ندوی کا یہ تبصرہ بڑا موزوں اور برمحل معلوم ہوتا ہے:

''سرسید مغربی تہذیب اور اُس کی مادی بنیادوں کی تقلید اور جدید علوم کو اُس کے عیوب و نقائص کے ساتھ بغیر کسی تنقید و ترمیم کے ساتھ اختیار کرلینے کے داعی تھے۔ سرسید نے شخصی طور پر انگریزی تہذیب اور طرزِمعاشرت کو اختیار کیا اور دوسروں کو بھی بڑی گرم جوشی اور قوت کے ساتھ اُس کی دعوت دی [۵۵]۔ انہوں نے مغربی نظامِ تعلیم کو اُس کی ساری تفصیلات، خصوصیات اور اُس کی روح و مزاج کے ساتھ درآمد کیا۔ انہوں نے صرف مغرب کے تعلیمی نظام ہی پر اصرار نہیں کیا بلکہ مغربی تمدّن [تہذیب] اور رُوح کے قبول کرنے پر بھی شدید اصرار کیا۔ غرضیکہ سرسید کی دعوت اور تعلیمی نظریہ مغربی تہذیب کی دعوت کے ساتھ لازم و ملزوم سا ہوگیا۔ انگریزی تعلیم اور انگریز پروفیسروں اور پرنسپل کے غیرمحدود اثر و نفوذ کی وجہ سے ملت اسلامیہ کے منتخب اور ذہین نوجوان، جو اس کالج میں زیرتعلیم تھے، انگریزی معاشرت و تہذیب سے متاثر و مرعوب ہوئے۔ ان اثرات اور مغربی ماحول کی وجہ سے جو کالج پر چھایا ہوا تھا، ایک ایسی اسلامی نسل پیدا ہوئی جو نام کے لحاظ سے مسلمان اور ذہن و دماغ کے لحاظ سے خالص مغربی تھی، معاشرت و تمدّن میں انگریزی طور و طریق کی پابند اور حامی، عقائد میں بعض اوقات کمزور اور متزلزل'' [۵۶]۔

علماء کا ردِّعمل ۱۸۵۷ء کے بعد:

۱۸۵۷ء سے قبل ان چند استثنائی مثالوں کے علاوہ علماء کا سوادِ اعظم انگریزی زبان اور جدید مغربی تعلیم سے لاتعلق ہی رہا۔ سرسید ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد پیش آنے والے حالات و واقعات نے انگریزی زبان اور جدید تعلیم سے علماء کی لاتعلقی و بے اعتنائی میں مزید اضافہ کردیا۔

انگریزوں نے جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد عام مسلمانوں اور بالخصوص علماء کو بدترین انتقام کا نشانہ بنایا تھا۔ بڑی تعداد میں علماء کو ملکۂ معظّمہ برطانیہ کی حکومت کے خلاف ''بغاوت'' کے الزام میں پھانسیوں پر چڑھایا گیا، ہزاروں کو عمر قید اور

جلاوطنی (جزائر انڈمان کی طرف) کی سزادی گئی۔ ہزاروں کی تعداد میں مساجد، مدارس، اور خانقاہوں کو مسمار اور نذرآتش کیا گیا [۵۷]۔ ان حالات و واقعات کے سبب انگریزی حکومت ہی نہیں بلکہ ان کی تہذیب و معاشرت، اُن کی قومی زبان اور تعلیم سے نفرت کا علماء کے دلوں میں پیدا ہونا ایک فطری امر تھا۔ علماء انگریزی حکومت کو ایسے ایک جارح و غاصب دشمن طاقت کے طور پر دیکھتے تھے، جو سیاسی وعسکری تسلط کے بعد مسلمانوں پر اپنی تہذیب و طرزِ معاشرت اور اپنے مذہب (عیسائیت) کو بزورِ شمشیر مسلط کرنے کے درپے تھی۔ چنانچہ علماء نے بالعموم مغربی تہذیب کی یلغار سے شکست خوردہ و شکستہ حال مسلم قوم کو بچانے کے لیے انگریزی زبان اور جدید علوم کے مکمل استرداد کا راستہ اختیار کیا۔ بعض علماء ایسے بھی تھے جنہوں نے انگریزی زبان اور جدید تعلیم کے خلاف سخت مزاحمت کا راستہ اختیار کیا۔ وہ انگریزی تعلیم کو مسلم قوم پر فاتح قوم کے مذہب اور اس کی تہذیب و معاشرت کے تسلط کا حربہ خیال کرتے ہوئے ازروئے اسلام ناجائز و حرام خیال کرتے تھے۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے اس صورت حال پر یوں تبصرہ کیا ہے:

''ذرا سوچیے کہ غم و غصّہ، بے زاری اور دل افگاری کے ان ایّام کو جن میں مسلمانوں کو ہندوستان جیسی اقلیم کی شہنشاہیت سے محروم کرکے غلام بنالیا گیا تھا، جو آسمانوں پر تھے زمین پر پٹک دیے گئے تھے۔ ان کے قلوب میں جیسا کہ چاہیے تھا، قدرتاً اس قوم کی طرف سے انتقام اور نفرت کی آگ بھری ہوئی ہو جس کے ہاتھوں اس سیاہ انجام تک وہ پہنچے تھے۔ ہر وہ چیز جو اس قوم کی طرف منسوب تھی، فطرتاً اس سے مسلمان بھڑکتے تھے، بلکہ چڑھتے تھے۔ انگریزی مدارس اور اُن مدارس میں جو کچھ پڑھایا جاتا تھا، اس کے تصوّر سے بھی وہ لرزہ براندام ہوجاتے تھے۔ ''جو انگریزی پڑھے گا وہ کافر ہوجائے گا''، مولویوں کی طرف اس تکفیری لطیفہ کو مسخروں نے جو منسوب کررکھا ہے، بجائے خود افتراء و بہتان کی یہ جتنی بھی شرمناک مثال ہو، لیکن اس کا شاید انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اسلامی آبادیوں کی فضا کچھ اسی قسم کی صداؤں سے معمور ضرور تھی۔ کس نے فتویٰ دیا؟ کب دیا؟ ان سوالوں سے بےتعلق ہوکر کچھ کہنے والے اسی قسم کی باتیں کہہ رہے تھے، اور اسی نوعیت کے چرچے عموماً پھیلے ہوئے تھے'' [۵۸]۔

انگریزی زبان، جدید تعلیم اور تہذیب و معاشرت سے علماء کی شدید نفرت کی مثالیں بھی تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔ ممتاز عالم مولانا عبدالرزّاق فرنگی محلی (۱۸۲۱-۱۸۸۹ء)، جنہوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران میں لکھنؤ کے محاذ پر انگریزوں کے خلاف جنگ میں سرگرم حصہ لیا تھا [۵۹] انگریزوں سے شدید نفرت کرتے تھے اور ان سے میل ملاقات کے قطعاً روادار نہ تھے۔ چیف کمشنر اودھ نے ان سے ملنے کی خواہش کی تو انہوں نے ملنے سے انکار کردیا۔ انہوں نے اپنے خطبات اور تقریروں میں یورپی آداب، عادات و اطوار کی تقلید و نقالی کی پُر زور انداز میں مخالفت کی۔ جب برطانوی حکومت کی طرف سے مولانا عبدالرزاق کو شمس العلماء کے خطاب کے عطا کیے جانے کا علان کیا گیا تو وہ اپنے گھر میں خلوت نشین ہوگئے اور اپنے بیٹوں سے کہہ دیا کہ وہ اس خطاب کو واپس کردیں۔ مولانا عبدالرزّاق نے ذاتی طور پر انگریزی مصنوعات کے استعمال اور ریل سے سفر سے اجتناب کیا۔ چنانچہ اس دور میں علماءِ فرنگی محل انگریز حکام سے کسی قسم کی راہ و رسم سے بالکل الگ رہے انہوں نے سرکاری ملازمتوں، امدادوں اور اعزازات حاصل کرنے سے انکار کردیا [۶۰]۔

انگریزی زبان اور مغربی تہذیب کے خلاف سخت مزاحمت کی ایک دلچسپ مثال ممتاز عالم دین مولانا محمد ادریس کاندھلوی(۱۸۹۹-۱۹۷۴ء) کے والد گرامی حافظ محمد اسماعیل (م:۱۹۴۳ء)، جو بڑے عالم اور محدّث تھے، کی ہے۔ حافظ محمد اسماعیل نے اپنی زندگی میں کسی انگریز کی شکل نہیں دیکھی، انگریزی کا کوئی لفظ استعمال نہیں کیا اور اپنے گھر میں کسی کو انگریزی کا لفظ استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی۔ وہ لفظ ٹماٹر جو شاید انگریزی لفظ (Tomato) کی اردو شکل تھی، کا لفظ استعمال نہیں کرتے تھے، اور اگر کوئی یہ لفظ بولتا تو اُس پر ناخوشی کا اظہار کرتے تھے۔ وہ اس کو نصرانیت کی علامت خیال کرتے تھے۔ حافظ محمد اسماعیل ٹماٹر کو لال بینگن کے نام سے پکارتے تھے [۶۱]۔

جن علماء نے بڑی شدّت کے ساتھ مغربی اثرات کے خلاف مزاحمت کی اور مسلمانوں کو اُن سے محفوظ رکھنے کی سعی کی، اس سعی میں اُنہوں نے مغرب کی مثبت چیزوں کو بھی روکا، انہوں نے یہ سب کچھ محض مسلمانوں کو محض مغربی ثمرات سے محفوظ رکھنے کی غرض سے نہیں کیا تھا، بلکہ مسلم عوام کو مغرب کی تہذیبی یلغار سے محفوظ رکھنے اور اسلامی تہذیب و معاشرت کے تحفظ و دفاع کی غرض سے کیا تھا۔

بایں ہمہ اس دور میں بھی جبکہ انگریزوں کے خلاف مسلمانوں اور بالخصوص علماء کے جذبات بڑے سخت تھے، علماء کے انگریزی زبان سیکھنے کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری (۱۸۳۸-۱۹۰۵ء) پر، جو سید احمد شہید کی تحریکِ جہاد (تحریکِ مجاہدین) کے خاص اراکین میں سے تھے، ۱۸۶۴ء میں حکومت کے خلاف بغاوت اور سازش کے الزام میں مقدمہ چلا (مقدمہ انبالہ) اور ضبطی جائداد اور حبسِ دوام بعبورِ دریائے شور کی سزا ہوئی [۶۲]۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری نے جزائر انڈمان میں قید کے دوران میں ایک شخص رام سروپ سے انگریزی پڑھی اور اس زبان میں لکھنے پڑھنے اور بولنے میں خاصی مہارت حاصل کرلی۔ مولانا محمد جعفر فرصت کے اوقات میں انگریزوں کو فارسی، اردو اور ناگری زبانیں سکھایا کرتے تھے۔ انگریزوں سے باہمی ربط و ضبط رکھنے اور ترجمہ ومشق کی وجہ سے انگریزی کی استعداد خاصی پختہ ہوگئی جہاں تک کہ وہ انگریزی میں عرضی اور اپیل لکھنے لگے۔ جزائر انڈمان میں ان کے سوا کوئی دوسرا مسلمان انگریزی خواں نہ تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کے مقدّمات میں بڑی مدد کی یہاں تک کہ بعض کی پھانسیاں تک منسوخ ہوئیں۔ انگریزی جاننے کی وجہ سے انہوں نے مسلمانوں کی گراں قدر خدمات انجام دیں [۶۳]۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری نے انگریزی زبان کی اہمیت کے بارے میں اپنی سرگزشت تواریخ عجیب میں لکھا ہے:

''انگریزی زبان علم اور فنون کا گھر ہے، جو انگریزی نہیں جانتا وہ بلاشبہ دنیا کے حالات سے ماہر نہیں اور بے انگریزی سیکھے پکا دنیادار اور طرحدار نہیں ہوسکتا اور نہ سوائے اس زبان کے آج کل کوئی آلہ زر کمانے کا ہے'' [۶۴]۔

علمائے اہلِ حدیث کے سرخیل شیخ الکل سید نذیر حسین دہلوی (۱۸۲۰ء- ۱۹۰۲ء) وہ سربرآوردہ عالم تھے جنہوں نے اپنے فتاوٰی میں بغرضِ حصولِ معاش و رفع حاجت کے انگریزی زبان پڑھنے (کی تحصیل) کو جائز قرار دیا [۶۵]۔ میاں سید نذیر حسین کے سوانح نگار مولانا فضل حسین بہاری کے بیان کے مطابق 'انگریزی تعلیم جب کفر خیال کی جاتی تھی تو

میاں صاحب نفسِ تحصیل علم کو جائز کہتے تھے، سرکاری نوکری جب حرام خیال کی جاتی تھی تو میاں صاحب اس کمائی کو حلال کہتے تھے'' [٦٦]۔

دینی تعلیم کا نظام اور انگریزی زبان:

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد علماء نئے عزم کے ساتھ اسلامی دینی روایت کے تحفظ، اسلامی و عربی علوم کی تعلیم و تدریس اور تبلیغ دین کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس غرض سے انہوں نے نئی درسگاہیں قائم کیں جن میں دارالعلوم دیوبند، مدرسۂ احمدیہ-آرہ (ضلع شاہ آباد، صوبۂ بہار) اور دارالعلوم ندوۃ العلماء-لکھنؤ بطورِ خاص قابل ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں علماءِ فرنگی محل نے بھی اقتضائے زمانہ کے مطابق اپنے مدرسہ (مدرسۂ عالیہ نظامیہ، فرنگی محل-لکھنؤ) میں دینی تعلیم کے نظام کو ازسرِ نو ترتیب دینے کی سعی کی۔ دارالعلوم دیوبند میں انگریزی زبان اور جدید علوم کی تعلیم سے مکمل طور پر اعراض کیا گیا۔ البتہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے کارپردازوں نے روایتی عربی و اسلامی علوم کے علاوہ انگریزی زبان اور جدید علوم کو بھی اس کے نصابات کا جزو بنایا۔ علماءِ فرنگی محل نے بھی مدرسہ عالیہ نظامیہ میں انگریزی زبان اور جدید علوم کی تعلیم و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ سطورِ ذیل میں انگریزی زبان کی تعلیم کے بارے میں ان درس گاہوں کے بانیوں اور منتظمین کے طرزِفکر کا جائزہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

دارالعلوم دیوبند:

دیوبند-ضلع سہارن پور (اترپردیش-ہندوستان) کا ایک تاریخی قصبہ ہے جہاں ۱۵محرّم ۱۲۸۳ھ/۳۰مئی۱۸۶۶ء کو چند مقامی اہلِ اخلاص نے پرانی ''چھتہ مسجد'' میں معمولی وسائل سے ایک دارالعلوم کا افتتاح عمل میں آیا، مولانا ملاّ محمود دیوبندی کو، جو بلند پایہ عالم تھے، مدرس مقرر کیا گیا، جبکہ مولانا محمود حسن دارالعلوم کے وہ اوّلین اشاگرد تھے جنہوں نے استاد کے سامنے کتاب کھولی [٦٧]۔ جلد ہی مولانا محمد قاسم نانوتوی (۱۲۴۸-۱۲۹۷ھ/ ۱۸۳۲- ۱۸۸۰ء) اور مولانا رشید احمد گنگوہی (م۱۳۲۳ھ) جیسے مدرّسین و منتظمین کی مساعی کی بدولت یہ دارالعلوم ایک تحریک بن گیا۔

دارالعلوم کے ان بانیوں نے ملاقطب الدّین سہالوی (م۱۶۸۱ھ) کے مرتب کردہ تعلیمی نصاب ''درسِ نظامیہ'' کو اس دارالعلوم میں جاری کیا(۱۸۶۹ء) البتہ تعلیمی دورانیہ دس سال سے کم کرکے چھ سال کیا گیا۔ اس کے نصاب میں انگریزی زبان اور جدید علوم و فنون جگہ نہ پاسکے۔ البتہ دارالعلوم کے بانیوں نے اگر انگریزی زبان اور جدید علوم کی طرف توجہ نہیں کی تو اُس کی مخالفت بھی نہیں کی [٦٨]۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی نے، جنہیں بالعموم دارالعلوم دیوبند کا بانی کہا جاتا ہے،

انگریزی تعلیم کی مخالفت نہیں کی لیکن انہوں نے اپنے تعلیمی پروگرام میں انگریزی زبان اور جدید علوم کی تعلیم کو کوئی جگہ بھی نہیں دی۔ مولانا کا خیال تھا کہ ''انگریزی علوم کو حکومت وقت کی سرپرستی حاصل ہے اس کے برعکس مسلمانوں کے روایتی

علوم سرکاری سرپرستی سے محروم ہیں، اگر انہیں سہارا نہ دیا گیا تو مسلمانوں کا اپنے ماضی سے رشتہ ٹوٹ جائے گا۔ لہٰذا حکومت جن علوم کی سرپرستی کررہی ہے ان کو تو حکومت کے سپرد رکھا جائے لیکن مسلمان جس علم سے محروم رہ جانے کے بعد مسلمان باقی نہیں رہ سکتے،اور نئی حکومت مسلمانوں کے ان علوم کی سرپرستی سے نہ صرف دست بردار ہی نہیں ہوگئی ہے بلکہ نئی حکومت کے پیدا کیے ہوئے ماحول میں زبوں حالی کے آخری حدود تک وہ پہنچ چکے ہیں ان علوم کے احیاء و بقا کا انتظام مسلم عوام کی مالی امداد سے کیا جائے۔'' [۶۹]۔ مولانا محمد قاسم انگریزی تعلیم کی ضرورت و اہمیت سے پوری طرح آ گاہ تھے البتہ ان کی رائے یہ تھی کہ اگر طلبہ دارالعلوم کے نصاب کی تکمیل کے بعد سرکاری مدارس میں جاکر جدید علوم کو حاصل کریں تو یہ بات ان کے لیے زیادہ مفید ہوگی۔ مولانا نے ۱۹ذیقعدہ ۱۲۹۰ھ/۹جنوری ۱۸۷۴ء کو دارلعلوم دیوبند میں جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر اپنی تقریر میں فرمایا تھا:

''اس کے بعد (یعنی دارالعلوم کے تعلیمی نصاب سے فارغ ہونے کے بعد) اگر طلبہ مدرسہ ہٰذا مدارس سرکاری میں جاکر علوم جدیدہ کو حاصل کریں تو اُن کے کمالات میں یہ بات زیادہ مؤید ثابت ہوگی'' [۷۰]۔

مولانا محمد قاسم کے اس بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ ''بقول سید مناظر احسن گیلانی''، ''انگریزی مدارس میں داخل ہوکر تعلیم پانے کے جواز کا فتویٰ دے رہے ہیں بلکہ اعلان فرمارہے ہیں کہ سرکاری مدارس میں شریک ہوکر علوم جدیدہ کی تعلیم علمی کمالات کے چمکانے اور آگے بڑھانے میں مولویوں کے لیے مفید ثابت ہوگی'' [۷۱]۔

مولانا محمد قاسم غیرمسلموں میں دعوت و تبلیغِ اسلام کی غرض سے انگریزی زبان کی تحصیل کو ضروری خیال کرتے تھے۔ ان کے نزدیک اس زمانہ میں مغربی زبانوں کو سیکھ کر اسلام کی خدمت کا موقع زیادہ مل سکتا تھا۔ خاص اس مقصد سے انہوں نے خود بھی زندگی کے آخری دور میں انگریزی زبان سیکھنے کا قطعی ارادہ کیا تھا۔ اُن کے سوانح نگار مولانا سید مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں کہ مولانا محمد قاسم آخری حج میں جب تشریف کے گئے تو کپتان جہاز سے، جو کوئی اطالوی باشندہ تھا، ایک انگریزی خواں مسلمان کے ذریعے سے مذہبی مسائل پر گفتگو ہوئی۔ مولانا کی گفتگو سے کپتان متاثر ہوا اور اُس نے مولانا سے عزّت و احترام کا برتاؤ کیا۔ ''اس واقعہ کا مولانا محمد قاسم پر اتنا اثر ہوا کہ آپ نے جہاز پر ہی عزم فرمالیا کہ واپس ہونے کے بعد میں انگریزی زبان خود سیکھوں گا۔ کیونکہ مولانا کو محسوس ہورہا تھا کہ جتنا اثر کپتان پر براہ راست گفتگو سے پڑسکتا تھا ترجمانی کے ذریعے وہ بات حاصل نہیں ہورہی تھی [۷۲]۔ چنانچہ دوسروں تک دین کی دعوت پہنچانے کے لیے انگریزی جیسی زبانوں کے سیکھنے کو بھی مولانا قاسم نے اپنے دینی مجاہدات کی فہرست میں شامل کرلیا تھا لیکن اجل نے واپس ہونے کے بعد فرصت نہ دی'' [۷۳]۔ بقول مولانا مناظر احسن گیلانی، اگر ''یہ صورت پیش آجاتی تو دارالعلوم دیوبند کی علمی تحریک کا رنگ یقیناً کچھ اور ہوتا'' [۷۴]۔مولانا محمد قاسم نانوتوی کے جانشین مولانا رشید احمد گنگوہی (۱۲۴۴-۱۳۲۳ھ) نے انگریزی زبان سیکھنے کو جائز قراردیا۔ انہوں نے ایک سوال/مسئلہ ''انگریزی پڑھنا اور پڑھانا درست ہے یا نہیں؟'' کے جواب میں فرمایا:

''انگریزی زبان سیکھنا درست ہے بشرطیکہ کوئی معصیت کا مرتکب نہ ہو اور نقصان دین میں اُس سے نہ آوے'' [۵۷]۔

گوکہ مولانا رشید احمد نے انگریزی سیکھنے کو مشروط طور پر جائز قرار دیا تاہم ان کے دور میں بھی دارالعلوم دیوبند میں انگریزی زبان رواج نہ پاسکی۔ مولانا عبیداللہ سندھی (۱۸۷۲-۱۹۴۴ء) کے بیان کے مطابق ''مولانا رشید احمد گنگوہی مدرسے کے صدر تھے۔ ان کی ذات سے اس کی بڑی ساکھ تھی اور وہ انگریزی زبان کی تعلیم اور انگریزی طور پر طریقوں سے سخت متنفّر تھے۔ انہیں یہ اندیشہ تھا کہ انگریزی زبان پڑھنے سے دل اور دماغ اسلام سے دور ہوجائیں گے۔ مولانا گنگوہی کو پرانی وضع سے بڑی دل بستگی تھی اور اس میں وہ کسی تبدیلی کے روادار نہ تھے'' [۶۷]۔ البتہ مولانا محمود حسن (۱۸۵۱-۱۹۲۰ء) کے دورِ صدارت (۱۹۰۵-۱۹۲۰ء) میں مولانا محمد قاسم نانوتوی کی اس تجویز کہ ''مدرسہ ہٰذا-دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی نصاب سے فارغ ہونے کے بعد طلبہ مدارس سرکاری میں جاکر علوم جدیدہ کو حاصل کریں، تو ان کے کمال میں بات زیادہ مؤید ثابت ہوگی'' [۷۷]۔ پر عملدرآمد کے کچھ امکانات پیدا ہوئے۔

۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء میں دستار بندی کے لیے جو تاریخی اجتماع دارالعلوم میں منعقد ہوا تھا، اُس میں علی گڑھ سے وفد صاحبزادہ آفتاب احمد خان(۱۸۶۷-۱۹۳۰ء)، جو بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی ہوئے (۱۹۲۴ء-۱۹۲۶ء)،کی قیادت میں شریک ہوا۔ صاحبزادہ آفتاب احمد نے اس موقع پر تجویز پیش کی کہ دارالعلوم کے تعلیم یافتہ علی گڑھ میں انگریزی پڑھنے جایا کریں اور علی گڑھ کے گریجوایٹ عربی پڑھنے کے لیے دیوبند آیا کریں [۸۷]۔ یہ تجویز منظور ہوئی اور اُس کے مطابق علی گڑھ کے چند ایک گریجوایٹ دارالعلوم دیوبند آ کر شریک بھی ہوئے، لیکن یہ عمل نتیجہ خیز ثابت نہ ہوسکا۔ ناظم جمعیۃ العلماء مولانا سید محمد میاں نے لکھا ہے:

''یہ تجویز نہایت مبارک خیال کی گئی مگر اُس کا ثمرہ نہایت تلخ تھا، یعنی پہلی مرتبہ جو علی گڑھ سے عربی حاصل کرنے کے لیے آئے وہ انگریز کے سی آئی ڈی تھے، جنہوں نے حضرت شیخ الھند [مولانا محمودحسن] کو گرفتار کرانے میں وطن دوستی اور قوم پروری کا حق ادا کرکے انگریز بہادر سے سپرنٹنڈنٹ سی آئی ڈی کا عہدہ حاصل کیا'' [۹۷]۔

اگرچہ دارالعلوم میں چند ایک گریجوایٹ حضرات شریک کرلیے گئے لیکن علی گڑھ میں دارالعلوم دیوبند سے کسی کو شریک کرنے کی کوئی صورت عملاً پیش نہ آسکی [۸۰]۔ یوں دارالعلوم دیوبند کے طلبہ کو انگریزی پڑھانے سے متعلق صاحبزادہ آفتاب احمد کی تجویز بروئے کار نہ آسکی اور فاضلین دارالعلوم دیوبند کو اسلامی و دینی علوم کی صلاحیت اور ان علوم سے کافی مناسبت پیدا کرلینے کے بعد جدید علوم اور نئی زبانوں سے کی تحصیل کا موقع فراہم نہ ہوسکا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی کے الفاظ میں ''تقریباً ایک صدی کی تاریخ میں کوئی ایک نمونہ بھی دارالعلوم دیوبند پیش نہ کرسکا'' [۸۱]۔

غرضیکہ علماءِ دیوبند انگریزی زبان سے بے اعتنائی کی روش پر ہی گامزن رہے۔ اس کا بنیادی سبب یہی بیان کیا جاتا ہے کہ وہ (علماء) انگریزی زبان کو فرنگیت و مغربیت کی اشاعت کا ایک بڑا طاقت ور اور مؤثر ذریعہ خیال کرتے تھے۔ انگریزی زبان اُن کے نزدیک مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقے میں مُلحدانہ افکار و خیالات اور غیراسلامی مغربی تہذیب و

معاشرت کی تقلید و نقالی اور انگریزی حکمرانوں کی فدویانہ و غلامانہ اطاعت کیشی کے رجحان و میلان کی افزائش کا محرّک بن رہی تھی۔ سرسید احمد خان نے مسلمان قوم کو انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب و معاشرت کی تقلید و نقالی اور انگریز حکمرانوں کی اطاعت کیشی کی دعوت جس جوش و جذبے سے دی تھی، اور علی گڑھ کالج میں جو تعلیمی اسکیم جاری کی تھی اُس کے نتیجے میں ایک مغرب زدہ طبقہ وجود میں آیا تھا۔ جس نے مذہب سے بے اعتنائی ہی نہیں بلکہ اس کے استحقار و استہزاء کو اپنا شعار بنالیا تھا۔ مغربی تہذیب کی مسلم عوام اور بالخصوص جدید تعلیم یافتہ طبقے میں غیرمعمولی تیزی کے ساتھ مقبولیت اور مسلمانوں کے عقائد اور اخلاق و معاشرت میں اُس کے اثرات کی وجہ سے ان علماء نے دفاعی پوزیشن اختیار کی۔ انہوں نے، بقول سید ابوالحسن علی ندوی، ''اسلامی طرزِ معاشرت کے مظاہر اور تہذیبِ اسلامی کے جتنے بچے کھچے آثار رہ گئے تھے، ان کو محفوظ رکھنے کی کوشش میں انگریزی تعلیم سے بے اعتنائی ہی کو اپنی حکمت عملی کا جزو ٹھہرایا'' [۸۲]۔ مولانا محمود حسن نے، جو دارالعلوم دیوبند اور علی گڑھ کے درمیان خلیج کو کم کرنے کے خیال کے پُرجوش مؤید تھے، انگریزی زبان سے اپنے اکابر سلف کی بے اعتنائی کا اہم سبب انہی امور کو قرار دیا ہے۔ انہوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اجلاسِ تاسیسی (منعقدہ علی گڑھ، ۲۹/اکتوبر ۱۹۲۰ء) کے موقع پر اپنے صدارتی خطبہ میں فرمایا:

''اے نونہالان وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار، جس میں میری ہڈیاں پگھلی جارہی ہیں، مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور سکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں (دیوبند اور علی گڑھ) کا رشتہ جوڑا۔ کچھ بعید نہیں کہ بہت سے نیک نیت بزرگ میرے اس سفر پر نکتہ چینی کریں اور مجھ کو اپنے مرحوم بزرگوں کے مسلک سے منحرف بتائیں۔لیکن اہل نظر سمجھتے ہیں کہ جس قدر میں بظاہر علی گڑھ کی طرف آیا ہوں، اس سے کہیں زیادہ علی گڑھ میری طرف آیا ہے۔ آپ میں سے جو حضرات محقق اور باخبر ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ میرے اکابرسلف نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان کے سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم و فنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا۔ ہاں یہ بے شک کہا گیا کہ انگریزی تعلیم کا آخری اثر یہی ہے جو عموماً دیکھا گیا ہے کہ لوگ نصرانیت کے رنگ میں رنگے جائیں یا مُلحدانہ گستاخیوں سے اپنے مذہب اور مذہب والوں کا مذاق اڑائیں یا حکومتِ وقتیہ کی پرستش کرنے لگیں تو ایسی تعلیم پانے سے ایک مسلمان کے لیے جاہل رہنا ہی اچھا ہے۔ اب ازراہِ نوازش آپ ہی انصاف کیجیے کہ یہ تعلیم سے روکنا تھا یا اُس کے اثر بد سے'' [۸۳]۔

مولانا رشید احمد گنگوہی کی سرپرستی کے دنوں میں دارالعلوم کی شوریٰ کے اجلاس میں ۱۳۲۱ھ میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ ایسے طلباء کو جو کم از کم انٹرنس پاس ہوں اور دارالعلوم میں داخلہ لینا چاہیں، اُن کو دس پندرہ روپیہ ماہانہ کے وظائف دیے جائیں، اسی طرح دارالعلوم سے فراغت کے بعد جو طلبہ انگریزی تعلیم حاصل کرنا چاہیں ان کے لیے بھی وظائف مقرر کیے جانے کی ضرورت ہے، روداد کے الفاظ یہ ہیں کہ ''دونوں صورتوں میں مسلمانوں کے لیے بہت سے فوائد ہیں۔'' افسوس

ہے کہ اس مَدْ میں عطیات نہ ہونے کی وجہ سے یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا [۸۴]۔

فتاوٰی علماءِ دیوبند:

انگریزی زبان کی تحصیل سے متعلق علماءِ دیوبند کے متعدد فتاوٰی بھی ملتے ہیں۔ مولانا رشید احمد گنگوہی کے فتویٰ کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے۔ دارالعلوم دیوبند کی شورٰی کے ایک ممتاز رکن مولانا محمد اشرف علی تھانوی (۱۲۸۰ء-۱۳۶۲ھ/۱۸۶۳-۱۹۴۳ء) نے، جن کا شمار دیوبند مکتبِ فکر کے مقتدرِ علماء میں سے ہوتا ہے، اس بارے میں متعدد فتاوٰی جاری کیے، جو اُن کے فتاوٰی کے مجموعہ امداد الفتاوٰی میں شامل ہیں۔ مولانا اشرف علی تھانوی کی رائے (فتویٰ) کے مطابق:

''انگریزی مثل اور زبانوں کے ایک مباح زبان ہے مگر تین عوارض سے اس میں خرابی آجاتی ہے۔ اوّل بعض علوم اس میں ایسے ہیں جو شریعت کے خلاف ہیں اور [عامۃ النّاس کی] علم شریعت سے واقفیت ہوتی نہیں اس لیے عقائد خلاف ہوجاتے ہیں جس میں سے بعض عقائد قریب کفر بلکہ کفر ہیں۔ دوسرے ایسے علوم کی بھی نوبت نہ آئے تو اکثر صحبت بددینوں کی رہتی ہے، ان کی بددینی کا اثر اس شخص پر آجاتا ہے، کبھی اعتقاداً جس کا حکم اوپر معلوم ہوچکا کبھی عملاً جس سے نوبت فسق کی آجاتی ہے۔ تیسرے اگر صحبت بھی خراب نہ ہو یا وہ مؤثر نہ ہو تو کم از کم اتنا ضرور ہے کہ یہ نیت رہتی ہے کہ اس کو ذریعہ معاش بنادیں گے خواہ طریقہ معاش حلال ہو یا حرام۔...... ان عوارضِ ثلاثہ کی وجہ سے گاہے کفر و الحاد تک، گاہے فسقِ ظاہری تک، گاہے صرف فسقِ باطنی تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ اگر کوئی ان عوارض سے مبرّا ہو، یعنی عقائد بھی خراب نہ ہوں، جس کا آسان طریقہ بلکہ متعین طریقہ یہی ہے کہ علم دین حاصل کرکے یقین کے ساتھ اس کا اعتقاد رکھے اور اعمال بھی خراب نہ ہوں۔ عزم بھی یہ رہے کہ اس سے وہی معاش حاصل کریں جو شرعاً جائز ہوگی۔ اور پھر اسی کے موافق عمل درآمد بھی کرے تو ایسے شخص کے لیے انگریزی مباح اور درست ہے۔ اور اگر اس سے بڑھ کر یہ قصد ہو کہ اس کو ذریعہ خدمت دین بنادیں گے تو اُس کے لیے عبادت ہوگی۔ حاصل یہ کہ انگریزی کبھی حرام ہے، کبھی مباح، کبھی عبادت'' [۸۵]۔

مولانا اشرف علی تھانوی نے اپنے ایک دوسرے فتوے میں دینی مصالح (مثل ردِّ نصارٰی و ہنود) کے علاوہ کسبِ معاش کے لیے بھی انگریزی سیکھنے کو صرف ان لوگوں کے لیے جائز قرار دیا ہے جو ضروریات دینیہ اور عقائد و مسائل سے واقف ہوں جبکہ دین سے واقفیت نہ رکھنے والوں کے لیے ممنوع۔ مولانا کی رائے (فتویٰ) ملاحظہ ہو:

''انگریزی ایسے ہی ہندی منجملہ لغات یعنی زبانوں کے ایک زبان ہے اور زبان فی نفسہٖ کوئی قبیح نہیں بلکہ نعمتِ خداوندی سے ایک نعمت ہے اور خود رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فارسی میں، کہ آپؐ کے زمانہ میں آتش پرستوں کی زبان تھی، تکلّم فرمایا۔ البتہ کبھی بعض عوارض کی وجہ سے قبیح لغیرہ ہوجاتی ہے۔ پس اگر وہ عوارض نہ ہوں صرف کسی مصلحت دینی مثل ردّنصارٰی [و] ہنود یا دنیوی مثل کسبِ معاش وغیرہ کے لیے سیکھے تو جائز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن ثابتؓ کو لغت و خط سریانی، کہ اس زمانہ میں یہود کا لغت اور خط تھا، واسطے مراسلت و مکاتبتِ یہود کے سیکھنے کے لیے فرمایا تھا (جامع الترمذی) ۔ اگر وہ عوارض ہوں تو اس وقت اجتناب واجب ہے...... سو اگر کوئی شخص جو اپنی ضروریات دینیہ

عقائد و مسائل سے واقف ہو اور ظنِ غالب ہو کہ یہ شخص بوجہ صحبتِ کفار و فجار کے ان خیالات یا رسوم یا وضع کی طرف مائل اور اپنے دین سے سست عقیدہ نہ ہوگا، واسطے کسب معاش حلال وغیرہ کے لیے انگریزی یا ہندی پڑھے، جائز ہے۔ اور جو ہنوز اپنے مذہب سے واقف نہیں خصوصاً جبکہ کم ہو اور غالب ہے کہ ایسے لوگوں کی مصاحبت سے ان کی طرف میلان و رجحان اور اپنے مذہب سے ضعفِ اعتقاد پیدا ہوگا، ایسے شخص کے لیے البتہ ممنوع و مصداق (**وبتعلمون مایضرھم ولا ینفعھم الآیة**)۔ کا ہے..... مگر آج کل تو اکثر دیکھا جاتا ہے کہ انگریزی پڑھنے سے خرابی پیدا ہوتی ہے۔ **ضرہ اقرب من نفعہ**۔ لہٰذا احتیاط مناسب ہے۔ کچھ اسی علم پر روزی منحصر نہیں اور ہوس کا کوئی منتہا نہیں'' [۸۶]۔

مولانا اشرف علی تھانوی کے مذکورہ بالا فتاوٰی سے صریح طور پر معلوم ہوجاتا ہے کہ وہ انگریزی زبان کو ضعف و فسادِ عقائد کا موجب گردانتے ہیں اور دینی علوم سے بے بہرہ افراد کے لیے اس کی تحصیل کو ناجائز و ممنوع خیال کرتے ہیں۔مولانا اشرف علی تھانوی کے فتاوٰی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی زبان کی تعلیم کی مخالفت سے اُن کا منشا محض کسی غیراسلامی زبان کی تعلیم کا عدم جواز نہ تھا بلکہ وہ اُن اثرات سے ڈرتے تھے جو اس زبان کے ساتھ ساتھ عامۃ النّاس میں سرایت کررہے تھے۔ مولانا اشرف علی تھانوی انگریزی زبان کو دارالعلوم کے نصاب کا جزو بنانے کے علاوہ دارالعلوم سے فراغت پانے والے طلبہ کو انگریزی سکھانے کے لیے جدید تعلیمی اداروں میں بھیجنے کے مخالف تھے۔ اس بارے میں ان کی رائے یہ تھی کہ طلبہ کو انگریزی سکھانے کے لیے خود دارالعلوم کے ذمہ داروں کی نگرانی میں الگ سے یہ انتظام ہونا چاہیے۔ جب کلکتہ کے ایک متموّل تاجر نے تھانہ بھون حاضر ہوکر یہ عرض کیا: ''(۱) مدرسہ دیوبند میں بقدر ضرورت تھوڑی سی انگریزی ہونی چاہیے۔ (۲) میرا خیال ہے کہ میں چند طلباء عربی کو کلکتہ لے جا کر انگریزی کی اعلیٰ تعلیم دلواؤں تاکہ دوسرے ممالک میں جا کر تبلیغ کرسکیں''۔ تو مولانا نے اس کے جواب میں فرمایا:

''مدرسہ میں انگریزی داخل ہونے سے خلط مبحث ہوجائے گا۔ اب جو کام مدرسہ میں ہورہا ہے یہ بھی نہ ہوگا۔ مدرسہ ایک معجون مرکب ہوجائے گا۔ اس کی بہتر صورت یہ ہے کہ مدرسہ کو تو اپنی اصلی حالت پر رہنے دیجیے جو کام ہورہا ہے ہونے دیجیے، اور انگریزی کے متعلق ایک درسگاہ الگ تیار کرا دیجیے اس کا نظم ونسق ان ہی حضرات کے ہاتھ میں رہے، عربی کا نظم ونسق فرما رہے ہیں اور صورت اس کی یہ ہو کہ عربی کے فارغ التحصیل طلبہ انگریزی درسگاہ میں تعلیم پائیں اور جب تک طلبہ فارغ التحصیل نہ ہوجائیں ان کو انگریزی تعلیم پانے کی اجازت نہ ہو، ہاں فراغت کے بعد کوئی حرج نہیں، اس لیے کہ قبل فراغ اندیشہ ہے اس طرف کے جذبات کے غلبہ کا اور بعد فراغ یہ اندیشہ نہ رہے گا۔ فراغ کے قبل اجازت نہ ہوگی، مصلحت یہ ہے کہ اکثر نقد غالب آجاتا ہے ادھار پر، اور اس صورت مجوزہ میں مدرسہ کا کوئی حرج نہ ہوگا۔ ایک یہ بات بھی ضروری ہے کہ کتابیں ختم کرنے کے بعد جب تک دو چار مرتبہ نہ پڑھا لے علم محفوظ نہیں رہ سکتا۔ سو فارغین گھنٹوں کے حساب سے دونوں کام کر سکتے ہیں یعنی فارغ التحصیل طلبہ اس صورت میں عربی بھی پڑھا سکتے ہیں اور انگریزی بھی پڑھ سکتے ہیں اور دوسری جگہ پہنچ کر فارغ التحصیل طلبہ کا بھی تعلیم انگریزی پانا مضرت سے خالی نہیں، ان کا یہ رنگ رہ ہی نہیں سکتا اور نہ اس کام کے بن سکتے ہیں جو آپ کی غرض ہے، اس کا بھی صحیح طریق یہی ہے کہ اپنے انہی قدیم

اساتذہ کی نگرانی میں تعلیم پائیں تاکہ ان کے جذبات پر برا اثر نہ پڑے، یہاں سے الگ ہوکر ان جذبات کا محفوظ رہنا مشکل ہے جس کا نتیجہ بجائے ہدایت کے گمراہی ہوگا اور انگریزی کو خود مدرسہ میں داخل کر دینے سے عوام کے اوپر بھی برا اثر ہوگا وہ شروع ہی سے اپنے بچوں کو تعلیم انگریزی کے لیے بھیجنا شروع کر دیں گے، ان کے پاس اس سمجھنے کا کوئی معیار ہی نہیں کہ اس کو مدرسہ دینیہ ہی کی شاخ بنا کر رکھنا چاہیے اور مدرسہ دینیہ ہی کے خدام اس انگریزی شاخ کے نگران رہیں اور میری مجوزہ صورت میں ہر مصلحت محفوظ رہ سکتی ہے اور جیسے مبلغ آپ چاہتے ہیں ویسے تیار ہوسکتے ہیں۔ اس لیے کہ جذبات وہی دین کے رہیں گے۔ غرض کہ مدرسہ دینیہ کے ماتحت انگریزی درسگاہ کو رکھنا چاہیے تاکہ انگریزی خانہ عربی خانہ سے زیادہ مقصود نہ ہوجائے، پھر اس اہتمام اور نگرانی کے بعد اگر کوئی بگڑے تو بگڑے ہم تو ذمہ دار نہ ہوں گے اور اس کے خلاف صورت میں ہم ذمہ دار ہوں گے، یہ ہے فرق دونوں صورتوں میں۔

آپ انگریزی تعلیم کے متعلق یہاں پر تھانہ بھون میں انتظام کر دیجیے میں ہر کام اپنی نگرانی میں رکھوں گا اور مدرسین کا انتخاب وغیرہ اپنی رائے سے کروں گا، طلباء کی نگرانی اور ان کے متعلق اصول و قواعد میں خود منضبط کروں گا'' [۸۷]۔

مدرسۂ احمدیہ، آرہ (ضلع شاہ آباد، صوبۂ بہار):

جنوبی اشیاء میں پہلے پہل انگریزی زبان کو دینی مدارس کے نصابات کا جزو بنانے کا سہرا مولانا سیّد نذیرحسین دہلوی کے تلامذہ کے سر ہے۔سید نذیرحسین دہلوی کے تلامذہ میں سے مولوی ابراہیم صاحب آروی (م۱۳۲۲ھ) خاص حیثیت رکھتے تھے۔'' جو نئی باتوں میں سے اچھی باتوں کو پہلے قبول کرتے۔ چنانچہ نئے طرز پر عربی مدرسۂ اور اس میں دارالاقامہ کی بنیاد کا خیال [پہلے پہل] انہی کے دل میں آیا اور انہی نے ۱۸۹۰ء میں مدرسہ احمدیہ کے نام سے ایک مدرسہ آرہ (ضلع شاہ آباد، صوبہ بہار) میں قائم کیا۔ اس مدرسۂ میں انگریزی بھی پڑھائی جاتی تھی [۸۸]۔ یہ مدرسہ مدتوں نہایت کامیابی اور خوش اسلوبی کے ساتھ چلتا رہا۔ سید نذیرحسین دہلوی کے نامور تلامذہ میں سے حافظ عبداللہ غازی پوری (م۱۳۳۷ھ/ ۱۹۱۸ء) اور مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی (مؤلف ''حسن البیان''، مقتدائے اہل حدیث مظفر پور و در بھنگہ-صوبۂ بہار) سالہاسال تک اس مدرسہ میں درس دیتے رہے۔ مولانا عبدالسّلام مبارک پوری، صاحب ''سیرت البخاری'' اور مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری جو مدرسۂ احمدیہ کے فیض یافتہ تھے اس کے تعلیمی اسٹاف میں بھی شامل تھے [۸۹]۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء:

۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء میں مدرسۂ فیضِ عالم کانپور کے جلسۂ دستار بندی کے موقع پر ندوۃ العلماء کے نام سے علماء کی ایک انجمن قائم ہوئی اور مولانا سید محمد علی مونگیری (۱۲۶۲-۱۳۴۶ھ/۱۸۴۶-۱۹۲۷ء) اس کے ناظم مقرر ہوئے۔ ندوۃ العلماء کے اغراض و مقاصد میں رفع نزاعِ باہمی (علماء کے مذہبی و فقہی نزاعات و اختلافات کا رفع کرنا)، اسلام کی تبلیغ و

اشاعت، مسیحی مبشّرین و مستشرقین کے اعتراضات کے مقابلہ میں اسلام کی حمایت و مدافعت اور اصلاحِ نصاب و طریقۂ تعلیم کو خاص اہمیت دی گئی [۹۰]۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء اس غرض سے قائم کیا گیا کہ اس میں علوم دنیوی اور علوم دینی کی تعلیم ایک ساتھ دی جائے اور اس سے ایسے روشن خیال علماء پیدا ہوں جو دونوں قسم کے علوم کے جامع ہوں اور وہ جدید اور قدیم گروہوں کے درمیان رابطہ اتحاد کا کام دیں اور اسلام کا وہ مکمل نقشہ ان کے پیش نظر ہو جس میں دین اور دنیا دونوں جمع کیے گئے ہوں [۹۱]۔

بانی ندوۃ العلماء مولانا سید محمد علی مونگیری (۱۲۶۲۔۱۳۴۶ھ/۱۸۴۶۔۱۹۲۷ء) نے دارالعلوم کے لیے جو نصاب مرتب کیا اس میں جدید فلسفہ، جدید ہئیت اور جدید تاریخ کی تعلیم و تدریس کی ضرورت کو پیش نظر رکھا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ جن علوم کی اہمیت اس زمانہ میں بہت بڑھ گئی ہے۔ ان کو نصاب میں داخل کیا جائے۔ مثلاً جدید علم کلام، ریاضی، اور تاریخ و جغرافیہ وغیرہ، منطق و فلسفہ، قدیم کے بڑے حصہ کو ترک کیا جائے اور صرف اس کے مفید اور ضروری اجزاء پر اکتفا کیا جائے۔ قرآن و حدیث اور فقہ کی طرف توجہ دی جائے [۹۲]۔ مولانا محمد علی مونگیری نے جدید علم کلام کی تدوین اور فلسفہ جدید کے ردّ کے لیے نیز دعوت و تبلیغ کے لیے طلباء علوم دینیہ کے لیے انگریزی زبان کا سیکھنا بھی ضرور قرار دیا۔ مولانا کے الفاظ ہیں:

''فلسفۂ جدید کا ردّ کرنے کے لیے زبان انگریزی کا جاننا بھی ضروری ہے کیونکہ یہ فلسفہ زبان انگریزی میں ہے اور ترجمہ کرا کے اس کا جواب دینا جیسا کہ ابتدائے اسلام میں فلسفۂ یونانی کے ساتھ کیا گیا، کافی نہیں ہوسکتا'' [۹۳]۔

مولانا سید محمد علی مونگیری کو اس بات کی بڑی فکر تھی کہ ہماری طلباء اور علماء جن کے ہاتھ میں امت کی زمام قیادت ہے۔ انگریزی زبان اور جدید علوم سے بہرہ مند ہوں اور اس کو اسلام کی ترجمانی کا ذریعہ بنائیں اور نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کے مغرب زد طبقہ پر اثر انداز ہوں بلکہ یورپ میں جا کر اسلام کا پیغام پھیلائیں [۹۴]۔ چنانچہ مولانا نے پوری قوت کے ساتھ انگریزی زبان کی تعلیم اور جدید علوم کے حصول پر زور دیا۔ وہ مسلمانوں کے دینی مصالح کے تحفظ کے لیے انگریزی کی ضرورت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''الغرض اس زمانہ میں دینی و دنیوی ضرورتیں ایسی درپیش ہیں کہ انگریزی زبان کا سیکھنا ضروری ہے کہ چند ہمارے علماء اس قدر انگریزی سے واقف ہوں کہ یورپ میں جا کر اسلام کے فضائل ان کی زبان میں بیان کریں تو بہت کچھ اسلام کی اشاعت ہو۔ اسی طرح اگر انگریزی میں رسائل لکھ کر مشتہر کرائے جائیں تو بھی بہت نفع ہو۔ غرض اس وقت دنیا میں بہت بڑا فرقہ اپنی سلطنت کے اعتبار سے اکثر روئے زمین پر حاوی ہے، اس کی زبان انگریزی ہے۔ لہٰذا تبلیغ اسلام کے لیے ضروری ہے کہ انگریزی زبان سیکھی جائے کیونکہ اب ان کو غلبہ ہے اور مسلمان مغلوب ہیں اور غالب مغلوب کی زبان سیکھنے پر مجبور نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا اگر مغلوب کو ان سے ضرورت پیش آئے تو بالضرور اسے غالب کی زبان سیکھنی ہوگی'' [۹۵]۔

مولانا محمد علی مونگیری نے یہ بات زور دے کر کہی کہ کفار کی زبان سیکھنے سے متعلق شریعت میں ہرگز کوئی ممانعت نہیں ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ''انگریزی بھی ایک زبان ہے جس طرح فارسی اور ترکی وغیرہ۔ جس طرح فارسی اور ترکی اولاً کفار کی

زبان تھی جب اس زبان والے ایمان لائے تو مسلمانوں میں وہ زبان شائع ہوئی۔ اسی طرح اگر خدا کا فضل ہو جس کے ہونے کی امید کی جاتی ہے اور انگریزی زبان والے اسلام لائیں تو ان کا [انگریزی کا] حال بھی فارسی ترکی زبان جیسا ہوجائے گا۔ اور جس طرح آپ فارسی میں کتب دینیہ لکھتے ہیں ان شاء اللہ انگریزی میں بھی دیکھیں گے۔ حاصل یہ ہے کہ اس وقت مضرّتوں کی اصلاح کر کے عربی و انگریزی دونوں حاصل کرنا چاہیے تاکہ اپنے بھائیوںچ کو فائدہ پہنچا سکے اور اپنے دین کو بھی محفوظ رکھ سکے، اس بنا پر ایسا کالج ہونا چاہیے جس میں عربی و انگریزی دونوں ہوں، اب جو انگریزی سے تعلق کرنا چاہے وہ ضروری علم عربی تحصیل کر کے انگریزی حاصل کرے'' [۹۶]

ستمبر ۱۸۹۸ء میں ندوۃ العلماء کے زیرِانتظام لکھنؤ میں ایک دارالعلوم (جو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نام سے موسوم ہوا) کا عملی افتتاح ہوا اور اُس کے ابتدائی درجات کھل گئے۔ تاہم اصلاحِ نصاب و طریقۂ تعلیم سے متعلق ندوۃ العلماء کے بانیوں کے بلند عزائم کے باوجود اس دارالعلوم کا نصاب دارالعلوم دیوبند کے نصاب سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا [۹۷]۔ ''دیوبندی نظام و نصاب تعلیم جو درسِ نظامی پر مبنی تھا اور ندوی نظام و نصاب تعلیم کے درمیان نصاب تعلیم کا اختلاف اصولی نہیں، جزئی نوعیت کا تھا'' [۹۸]۔ البتہ اس کے نصاب عربی زبان و ادب کی تعلیم و تدریس پر خاص توجہ گئی۔ مزید برآں تاریخ اور جغرافیہ کے علاوہ انگریزی زبان کو بھی نصاب کا حصہ بنایا گیا ۔ ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۲ء میں ''سیکنڈ لینگویج کی حیثیت سے انگریزی کا ایک کلاس کھول دیا گیا اور اس مقصد کے لیے انگریزی کے ایک مدرّس کا تقرر بھی عمل میں آ گیا'' [۹۹]۔ تاہم ندوۃ العلماء کے ایک دوسرے سربرآوردہ رکن مولانا شبلی نعمانی(۱۸۵۷-۱۹۱۴ء) چاہتے تھے کہ نصابات میں انگریزی زبان اور جدید علوم بھی شامل کیے جائیں، تاکہ ایسے داعی اور مبلغ تیار ہوسکیں جو مسیحی مبشرین و مستشرقین کے اعتراضات کا ردّ کرسکیں اور مغرب کے غیرمسلموں کو اسلام کی دعوت مؤثر طور پر پہنچاسکیں۔مولانا شبلی نے خاص اس غرض سے دارالعلوم میں انگریزی زبان کی تعلیم و تدریس کی پُرزور حمایت کی تھی [۱۰۰]۔

مولانا شبلی نعمانی نے ایک عرصہ تک علی گڑھ میں قیام کیا تھا (۱۸۸۳-۱۸۹۸ء)، جہاں وہ سرسید احمد خان کے معتمد علیہ بن گئے تھے۔علی گڑھ کالج میں انہیں نئے خیالات، نئے جذبات، زمانہ کے نئے اثرات اور مغربی زبان خصوصاً انگریزی کی ضرورت و اہمیت سے آگاہی ہوئی تھی۔علی گڑھ کالج میں قیام اور مصر و شام و ترکی کی سیاحت نے عصرِ جدید میں علماء کے فرائض کی ضرورتوں کو ان پر منکشف کردیا۔علی گڑھ میں انہوں نے پروفیسر آرنلڈ(م۱۹۳۰ء) سے کچھ فرانسیسی زبان بھی پڑھی۔تعلیم کے سلسلہ میں دونوں ایک دوسرے کے خیالات سے بھی واقف ہوئے [۱۰۱]۔ مولانا کالج میں رہ کر کسی قدر انگریزی سے صرف شناس ہوگئے اور معمولی عبارت سمجھ لیتے تھے [۱۰۲]۔علی گڑھ کالج کا ان پر ایک بڑا اثر یہ ہوا کہ انگریزی کی تعلیم کی ضرورت ان پر الم نشرح ہوگئی اور اُن کو مسلمان قوم میں انگریزی تعلیم کی اشاعت کے ساتھ گہرا انہماک پیدا ہوگیا [۱۰۳]۔ مولانا شبلی کو انگریزی زبان کی ضرورت کا احساس اتنا ہوگیا تھا کہ وہ علماء کے لیے بھی اس کا جاننا ضروری خیال کرتے تھے۔ انہیں قدیم نظامِ تعلیم میں اصلاح کی ضرورت کا بھی احساس تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ نصاب میں سے قدیم

یونانی فلسفہ کی کتابیں نکال کر جدید فلسفہ کی کتابیں داخل کی جائیں۔ دوسرے یہ کہ علماء تعلیم یافتوں کی اصلاح، یورپ میں تبلیغ اور مستشرقین کے اعتراضات کے جواب اور اُن کی غلطیوں کی اصلاح کے لیے انگریزی پڑھیں [۱۰۴]۔ خصوصاً جب مولانا شبلی نے سیرتُ النّبی کی تالیف کا آغاز کیا تو انہیں اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں مستشرقین کے خیالات و آراء سے آگاہی کے لیے انگریزی اور دیگر مغربی زبانوں سے واقفیت کی ضرورت کا شدّت سے احساس ہوا۔ سیرت النبی کے سلسلہ میں انگریزی ذخیرے سے واقفیت کے لیے انہوں نے سیرت کا دفتر قائم کیا اور انگریزی کے مترجمین کی خدمات حاصل کیں [۱۰۵]۔ چنانچہ مولانا شبلی دارالعلوم ندوۃ العلماء میں اسلامی علوم کے ساتھ ساتھ جدید مغربی علوم اور انگریزی زبان کی تعلیم کے زبردست داعی و حامی تھے۔ انہوں نے ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۹۱۰ء سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''عربی قدیم مدارس کا حال یہ ہے کہ نہ ان میں انگریزی زبان کی تعلیم ہوتی ہے اور نہ جدید علوم و فنون پڑھائے جاتے ہیں نہ نئے خیالات سے ان کو واقف کرایا جاتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس قسم کے تعلیم یافتہ جدید تعلیم یافتہ افراد کے خیالات پر کیا اثر ڈال سکتے ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دونوں گروہ ایک دوسرے کے خیالات سمجھ بھی نہیں سکتے۔ ندوۃ العلماء کا دارالعلوم درحقیقت ایک ''جامعہ دینیہ'' یعنی ایک مذہبی یونیورسٹی کا سنگ بنیاد ہے۔ آج مسلمانوں کو سب سے زیادہ ایک ایسی مذہبی یونیورسٹی کی ضرورت ہے۔ جس میں اسلامی علوم اعلیٰ درجے تک پڑھائے جائیں، جس میں یورپین علوم و فنون کی تعلیم کا کافی بندوبست کیا جائے، جو جدید علم کلام پیدا کر سکے، جس کے تعلیم یافتہ انگریزی زبان میں وعظ اور مذہبی لیکچر دے سکیں، اس قسم کی یونیورسٹی کی ضرورت اور اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے''[۱۰۶]

مولانا شبلی بڑی قوت و طاقت سے کہتے تھے کہ ''مذہبی تعلیم کے ساتھ انگریزی تعلیم کی ضرورت ہے۔ موجودہ فلسفہ کا مقابلہ علوم جدیدہ کی واقفیت کے بغیر کیونکر ہوسکتا ہے؟ یورپ میں اسلام کی اشاعت انگریزی دانی کے بغیر کیونکر ہوسکتی ہے؟ آریوں اور عیسائیوں کے مذہبی حملوں کا علم انگریزی دانی کے بغیر کیسے ہوسکتا ہے''[۱۰۷] مولانا شبلی کی رائے تھی کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے تمام طلبہ کے لیے انگریزی لازمی کی جائے۔ انہوں نے سید سلیمان ندوی کے ایک سوال کہ ''آپ مدرسہ میں انگریزی کو کیوں لازم قرار دیتے ہیں؟'' کے جواب میں فرمایا:

''نئی تعلیم کس تیزی سے پھیلتی جاتی ہے، اسی کے ساتھ عربی زبان کی تعلیم اعلیٰ مسلمان خاندانوں سے مٹتی جاتی ہے۔ اب نئے تعلیم یافتوں کی مذہبی واقفیت کا مدار انگریزی کی کتابوں اور اسلامی کتابوں کے ترجموں پر رہ جائے گا۔ اس وقت ہمارے مذہبی علوم کی کیا حالت ہوگی۔ اب بھی دیکھو جب غیرمذہبی تعلیم یافتوں کو قرآن پاک کے سمجھنے کا شوق ہوتا ہے تو وہ اپنی اس پیاس کو سیل [G. Sale] کے انگریزی ترجمہ سے بجھاتے ہیں۔ فقہ اسلامی کا مدار ہدایہ کے انگریزی ترجمہ پر رہ گیا ہے۔ کیا یہ کام ہمارے علماء کا نہیں؟'' [۱۰۸]۔

مولانا شبلی کہتے تھے کہ ''اگر فقہاء انگریزی جانتے ہوتے اور ہماری فقہ کو انگریزی میں منتقل کر سکتے تو ہدایہ وغیرہ کے

انگریزوں اور غیرمسلموں کے کیے ہوئے غلط سلط ترجمے آج عدالتوں میں سند قرار نہ پاتے'' [۱۰۹]۔ مولانا شبلی کی رائے تھی کہ ''ایسے علماء جو موجودہ زمانے میں اپنے علمی وقار کو قائم رکھ سکیں، معترضینِ اسلام کے جوابات دے سکیں اور نئے تعلیم یافتوں کی تشفی کرسکیں بغیر اس کے ممکن نہیں کہ وہ انگریزی زبان سے تھوڑی واقفیت رکھیں'' [۱۱۰]۔

غرضیکہ مولانا شبلی نعمانی ندوۃ العلماء کے نئے مدرسہ میں انگریزی کے پڑھانے پر مُصر تھے۔ انہوں نے دارالعلوم کے نصاب میں اس کے داخل کیے جانے کی تحریک ۱۸۹۹ء میں کی مگر کامیاب نہ ہوئی۔ سید سلیمان ندوی کے بقول: ''ندوۃ کے اجلاس اگست ۱۸۹۹ء میں مولانا نے دارالعلوم کے نصاب میں انگریزی زبان کے داخل کرنے کی تحریک کی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عام مسلمانوں کا انگریزی پڑھنا تو کفر نہیں رہا تھا مگر علماء کا انگریزی جاننا تو جرم عظیم سمجھا جاتا تھا۔ مولانا اس جرم عظیم کے مرتکب ہوئے۔ انہوں نے تحریک کی مگر اس وقت علماء کی عصبیت کا یہ عالم تھا کہ وہ منظور نہ ہوسکی۔ علماء اس بدعت کے لیے کسی طرح آمادہ نہیں ہوسکتے تھے، حیرت یہ ہے کہ مولانا شیروانی [مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی(۱۸۶۶-۱۹۵۰ء)] جیسے روشن ضمیر و روشن خیال عالم نے خود مولانا شبلی کی بدنامی کے ڈر سے اس بحث سے اعراض فرمایا'' [۱۱۱]۔ آخر کار مولانا شبلی کے اصرار پر ۱۹۰۳ء میں انگریزی ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے شریکِ نصاب کی گئی [۱۱۲]۔ آخر ربیع الاوّل ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء میں دارالعلوم میں پندرہ روپے ماہوار پر ایک انگریزی کا استاد مقرر ہوگیا اور کچھ طالب علموں نے اے بی سی ڈی پڑھنا شروع کی مگر یہ تعلیم دقع الوقتی سے زیادہ نہ تھی۔ سالہاسال کے بعد بھی کوئی پرائمری سے آگے نہیں پڑھا۔ مولانا شبلی چند سال بعد ۱۹۰۵ء میں دارالعلوم کے معتمدِ تعلیمات ہوئے تو اُن کے اصرار سے ہرلڑکے کے لیے انگریزی زبان کی تعلیم لازمی قرار دی گئی [۱۱۳]۔ انگریزی کی یہ تعلیم اتنی تھی کہ طالب علموں میں میٹرک تک کی لیاقت پیدا ہوجائے۔ مولانا شبلی کا خیال تھا کہ ۸برس کی عربی تعلیم کے بعد دو برس خاص انگریزی تعلیم کے لیے انگریزی کا ایک درجۂ تکمیل کھولا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ جب طلبہ درجہ تکمیل میں دو برس تک اور صرف انگریزی پڑھیں گے تو زبان دانی میں قابل گریجوایٹوں کی برابری کرسکیں گے اور اس وقت انگریزی میں تبلیغِ اسلام کی خدمت انجام دے سکیں گے [۱۱۴]۔

مگر یہ درجہ دارالعلوم میں قائم نہ ہوسکا۔ افسوس کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں قدیم و جدید کی یکجائی اور امتزاج کا مقصد بھی حاصل نہ ہوسکا۔ دارالعلوم میں انگریزی کا جو نصاب رائج کیا گیا وہ اس قدر معمولی تھا کہ اس سے طلباء میں اتنی استعداد ہرگز پیدا نہ ہوسکتی تھی کہ وہ انگریزی زبان میں تصنیف و تالیف اور دعوت وتبلیغ کا وظیفہ بجا لاتے۔ بالفاظِ مجیب احمد (سابق شیخ الجامعہ، جامعہ ملّیہ اسلامیہ- دہلی) ۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے بانیوں کا یہ خیال کہ انگریزی زبان، تاریخ اور جغرافیہ کا معمولی علم طلباء میں فلسفہ جدید کے ردّ اور مستشرقین کے اعتراضات کے جواب اور مغرب میں دعوت تبلیغ اسلام کی صلاحیت پیدا کر دے گا، درست نہ تھا'' [۱۱۵]۔ بایں ہمہ علامہ شبلی کا تصور رائیگاں نہیں گیا۔

بایں ہمہ دارالعلوم میں انگریزی کی تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ کئی طلبہ نے انگریزی پڑھ کر مفید علمی اور مذہبی خدمت انجام دی۔ دارالعلوم کے بعض طلبہ ایسے بھی ہوئے کہ جنہوں نے علومِ عربیہ کی باضابطہ تحصیل کے بعد جدید اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ان

میں مولانا حکیم سید عبدالعلی (۱۸۹۳-۱۹۶۱ء)، جو بعد میں عرصہ تیس سال تک (۱۹۳۱-۱۹۶۱ء) ندوۃ العلماء کی نظامت پر فائز رہے، کے علاوہ مولوی مصطفیٰ کریم ندوی (تلمیذِ سید سلیمان ندوی) بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ اوّل الذکر نے ندوہ اور دیوبند سے فیض یاب ہونے کے بعد لکھنؤ کے ایک مشنری اسکول جس میں یورپین عیسائی اساتذہ نمایاں تھے، میں داخلہ لیا اور ۱۹۱۵ء میں میٹریکولیشن کا امتحان پاس کیا، جبکہ لکھنؤ کے کرسچن کالج (کیننگ کالج) سے انگریزی ادب اور علم النّبات (باٹنی) کے مضامین کے ساتھ بی ایس سی امتیاز کے ساتھ کیا (۱۹۱۹ء)۔ اور بعد ازاں کنگ جارج میڈیکل کالج لکھنؤ سے ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کی(۱۹۲۵ء) [۱۱۶]۔ دارالعلوم کے ایک دوسرے طالب علم مولوی مصطفیٰ کریم ندوی نے علوم عربیہ کی باضابطہ تکمیل کے بعد سائنس (باٹنی) میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم ایس سی کی ڈگری حاصل کی اور وہ بھی امتیاز کے ساتھ [۱۱۷]۔

علماءِ فرنگی محل، لکھنؤ:

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں انگریزی تعلیم داخل ہونے کے بعد بعض دوسرے مدرسوں میں بھی انگریزی پڑھائی جانے لگی۔ اس سلسلہ میں علماءِ فرنگی محل-لکھنؤ کا مدرسۂ عالیہ نظامیہ بطور خاص قابل ذکر ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد انگریزی زبان کے معاملہ میں علماءِ دیوبند کے مقابلہ میں علماءِ فرنگی محل کا طرزِفکر وعمل مختلف رہا۔ ممتاز فرنگی محلی عالم ابوالحسنات محمد عبدالحی (۱۸۴۸-۱۸۸۶ء) کا شمار اُن معدودے علماء میں سے ہوتا ہے جنہوں نے علی گڑھ کالج کے قیام کی حمایت کی تھی اور اُس کے حق میں فتویٰ دیا تھا۔(مزید براں) مولانا عبدالحی نے اپنے متعدد فتاوٰی میں انگریزی زبان سیکھنے کو شرعاً جائز اور مباح قراردیا [۱۱۸]۔ مولانا عبدالحی کی رائے میں ''شرعاً کسی زبان کے سیکھنے کی، اگرچہ وہ کفار کی زبان ہو، ممانعت وارد نہیں ہے۔ اس طور سے فی الواقع نفس تعلیم زبان انگریزی شرعاً ممنوع نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن ثابتؓ کو زبانِ یہودی سیکھنے کا حکم کیا جیسا کہ جامع ترمذی میں مروی ہے۔ انگریزی پڑھنا اور زبان سیکھنا بشرطیکہ دین میں مخل نہ ہو جائز ہے۔ اگر انگریزی زبان پڑھنا اور اس کی خط و کتابت سیکھنا انگریزوں کے ساتھ محبت اور مشابہت کی وجہ سے ہو تو ناجائز ہے ورنہ اُن کے مضامین اور کتابوں سے مطلع ہونے اور اُن کی تحریرات پڑھنے کی غرض ہو تو حرج نہیں'' [۱۱۹]۔

مولانا عبدالحی کے ان فتاوٰی سے دیگر علماءِ فرنگی محل پور اتفاق کرتے تھے [۱۲۰]۔ علماء فرنگی محل کے متأخرین میں مولانا ابوالحسنات عبدالحی کے بعد مولانا قیام الدین عبدالباری (۱۸۷۹-۱۹۲۶ء) کی ذات نمایاں ہوئی تھی۔ مولانا عبدالباری نے فرنگی محل میں مدرسہ نظامیہ کے نام سے ایک باقاعدہ مدرسۂ عربیہ کی بنیاد ڈالی، جس سے متعدد اصحابِ فکر اور اہلِ قلم طلبہ پیدا ہوئے [۱۲۱]۔ مولانا عبدالباری کے طرز فکر وعمل سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ برطانوی اقتدار کے تحت ملک میں سیکولر مغربی تعلیم کی اشاعت سے پیدا ہونے والے اثرات و نتائج کا پورا ادراک رکھتے تھے۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ انگریزی تعلیم کی

تحصیل ایک طرف تو بہتری معاشی مواقع کا وسیلہ ہے تو دوسری طرف نہ چیز مسلمانوں کی نوخیز نسل کی اپنے دین و مذہب سے دوری و بیگانگی کا سبب بن رہی ہے۔ مدرسۂ عالیہ نظامیہ کی بارہویں سالانہ رپورٹ میں مولانا عبدالباری انگریزی تعلیم کی طرف سے درپیش تحدّیات کے متعلق فرماتے ہیں:

''یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ مسلمانوں میں مذہبی تعلیم روز بروز زوال پذیر ہے۔ اس وقت مسلمانوں میں دو طرح کے لوگ ہیں۔ ایک طرف وہ لوگ ہیں جنہوں نے قدیم تعلیمی اداروں سے تعلیم حاصل کی ہے۔ وہ قدیم خطوط پر مذہب کو سمجھتے ہیں اور جدید دور کے تقاضوں سے آگاہ نہیں ہیں۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو مذہب کو علماءِ اسلام سے نہیں بلکہ یورپی مصنفین اور دانش وروں [مستشرقین] کی تصنیفات سے سیکھتے ہیں وہ مذہب سے آگاہی مسلم علماء سے نہیں بلکہ سپنسر (Spenser) یا جارج سیل [George Sale] کے انگریزی ترجمۂ قرآن سے حاصل کرتے ہیں۔ مؤخر الذّکر گروہ راہِ راست سے بھٹک چکا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑا دکھ پہنچتا ہے کہ یہ جدید تعلیم یافتہ افراد عربی زبان سے عدم واقفیت کے سبب قرآن حکیم کا مطالعہ جارج سیل کے ترجمۂ قرآن کے ذریعہ سے کرتے ہیں'' [۱۲۲]۔

مولانا عبدالباری نے انگریزی تعلیم کی اشاعت کے نتیجے میں رونما ہونے والے چیلنجوں/ تحدّیات کے مقابلہ کے لیے ایک ایسا حل تجویز کیا جو مولانا محمد عبدالحی کے افکار سے ہم آہنگ تھا۔ انہوں نے ''فرنگی محل کے اطفال کے لیے خاص کر اور عامۂ اہل اسلام کے لیے مدرسۂ نظامیہ قائم کیا(۹جمادی الاوّل۱۳۱۳ھ) اور اُس میں جدید طریقۂ تعلیم کو جاری فرمایا'' [۱۲۳]۔

مولانا عبدالباری نے مدرسۂ عالیہ نظامیہ میں انگریزی زبان اور جدید علوم کی تدریس کو وقت کی اہم ضرورت قرار دیا۔ چنانچہ ۱۹۰۵ء میں علماءِ فرنگی محل نے درس نظامیہ میں تبدیلیاں متعارف کرائیں۔ ریاضی، الجبرا، جیومیٹری اور جغرافیہ جیسے جدید علوم بطور لازمی مضمون شاملِ نصاب کیے گئے جبکہ انگریزی زبان کو درس نظامیہ کے آخری درجوں کے نصابات کا لازمی جزو بنایا گیا۔ انگریزی زبان کی تدریس کے لیے مدرسین، دیگر علوم و فنون کے مدرسین کے مقابلہ میں بھاری تنخواہ پر رکھے گئے [۱۲۴]۔ تاہم علماءِ فرنگی محل کو اس معاملہ میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوسکی۔ اگرچہ انگریزی زبان کی تحصیل کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ نہ جیسا کہ ۱۹۴۶ء کی سالانہ رپورٹ میں تسلیم کیا گیا ہے، طلبہ نے انگریزی کی طرف مناسب توجہ نہیں کی۔ اگرچہ انہیں انگریزی کی شُد بُد ہوگئی تھی تاہم وہ اس میں مہارت پیدا کرنے میں ناکام رہے [۱۲۵]۔

۱۹۲۰ء اور بالخصوص ۱۹۳۰ء کی دہائی میں علماءِ فرنگی محل کی قدیم خاندانی تعلیمی روایت میں ایک بڑی تبدیلی رُونما ہوئی۔ خاندان کی نئی پود برطانوی اقتدار کے تحت بہتر معاشی امکانات کی جستجو میں، مذہبی تعلیم کے بجائے جدید مغربی تعلیم حاصل کرنے لگی۔ اس پیش رفت کا سب سے اہم اور قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ قدیم خاندانی تعلیمی روایت میں تبدیلی کا فیصلہ نوخیز نسل نے نہیں بلکہ بزرگوں (یعنی خود علماء) نے کیا تھا [۱۲۶]۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی تک خاندان کی نئی نسل کے اکثر افراد جدید مغربی تعلیم حاصل کرنے لگے تھے جبکہ دینی تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد بہت کم رہ گئی۔ حتیٰ کہ خاندان کی بچیاں/لڑکیاں بھی جدید تعلیم حاصل کرنے لگیں [۱۲۷]۔ دراصل فرنگی محل کے علماء نے انگریزی زبان اور جدید تعلیم کے بارے

میں مخالفانہ رویہ اختیار نہیں کیا۔ مولانا محمد عبدالحی نے علی گڑھ کالج کے قیام کی حمایت کی تھی تو ان کے جانشین مولانا عبدالباری نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے فنڈ میں پانچ صد روپے (۵۰۰) روپے دیے [۱۲۸]۔

اختتامیہ:

برّعظم پاک و ہند انگریزی زبان کی ترویج و اشاعت کے بارے میں علماء و فقہاء کا ردّ عمل مختلف النوع عوامل کے تابع رہا ہے۔ اس خطے میں انگریزی زبان کی اشاعت میں کیونکہ مسیحی مبشرین نے بڑی سرگرمی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ اس کو عیسائیت کی اشاعت و تبلیغ کا ایک موثر وسیلہ گردانتے تھے۔ چنانچہ ان کے قائم کردہ تعلیمی اداروں میں عیسائیت کی تعلیم تعلیمی نصابات کا لازمی جزو ٹھہری تھی۔ بدیں وجہ علماء نے ان تعلیمی اداروں میں مسلمان بچوں کی تعلیم و تربیت کی مخالفت کی تھی۔انگریزی زبان سے علماء کی نفرت و بے زاری کا ایک سبب خود سرسید احمد خان کی تعلیمی تحریک اور ان کی دینی تعبیرات و تشریحات تھیں۔ سرسید نے مسلمانوں کو جدید مغربی تعلیم کی تحصیل کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب و معاشرت کی تقلید کی دعوت پُرزور انداز میں دی تھی۔ چنانچہ علماء انگریزی تعلیم کو مغربیت (Westernization) کا موجب خیال کرتے تھے۔ جدید تعلیم ان کی نظر میں مسلمان کے عقیدہ و ایمان اور تہذیب و معاشرت کے غیر موافق تھی تاہم مسلمانوں کے بہت سے معاشی و سیاسی مصالح جدید تعلیم خصوصاً انگریزی دانی سے وابستہ ہوگئے تھے چنانچہ علماء زیادہ دنوں تک انگریزی زبان سے لاتعلق نہیں رہ سکتے تھے۔ خود نئی نسل میں اسلامی عقائد و تعلیمات کی تبلیغ کے لیے انگریزی ایک ناگزیر ضرورت بن گئی تھی۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمود حسن، اور ندوۃ العلماء کے بانیوں نے بجا طور پر اس ضرورت کو محسوس کیا لیکن وہ عملاً انگریزی زبان کی تعلیم و تدریس کو جاری نہ کر سکے۔ گو ندوۃ العلماء اور علمائے فرنگی نے اپنی درس گاہوں کے نصابات کا جزو ضرور بنا دیا۔ لیکن اس کا معیار اس قدر کم تھا کہ وہ خاطر خواہ نتائج پیدا کرنے سے قاصر رہا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء اور مدرسہ نظامی العالیہ میں انگریزی کا جو نصاب رکھا گیا وہ فارغ التحصیل ہونے والوں میں اتنی استعداد پیدا کرنے سے قاصر تھا کہ وہ انگریزی میں تصنیف و تالیف اور دعوت و تبلیغ کا وظیفہ انجام دے سکیں۔ بایں ہمہ ان کا یہ اقدام انتہائی جرأت مندانہ ضرور تھا کہ انہوں نے آئندہ کے لیے انگریزی زبان کو دینی مدارس کے نصاب کا جزو بنانے کی ایک مثال قائم کی۔

حواشی

۱۔ ہارڈی، پی (Hardy, p)، ۱۹۷۲ء، ص۳۶-۳۸؛ مسرا، بی.بی. (Misra, B.B.)، ۱۹۵۹ء، ص۲۲۰-۳۳۷؛ فیضی، آصف اے.اے.، ۱۹۵۵ء، ص۳۷۔

۲۔ ہدایہ کا پہلے فارسی میں ترجمہ جو گورنر جنرل سر جان شور (Sir John Shore، ۱۷۹۷-۱۷۹۸ء) کے ایماء پر قاضی القضاۃ مولانا نجم الدین کاکوروی علوی (۱۱۵۷ھ/۱۷۴۴ء) نے کیا تھا۔ (دیکھیے: سلیم، سیّد محمد،

۱۹۹۳ء، ص۵۹-۶۰) اور پھر فارسی سے انگریزی میں ترجمہ کرایا گیا۔ مستشرق جیمز اینڈرسن (James Anderson) ہملٹن (Hamilton) کے قلم سے یہ ترجمہ پہلی بار ۱۷۹۱ء میں شائع ہوا، اس کا عکس لاہور سے بھی شائع ہوا ہے(۱۹۵۹ء)۔ یہ ترجمہ،جو ہدایہ کے فارسی ترجمہ پر مبنی ہے، ناقص خیال کیا جاتا ہے۔ دیکھیے: علی، عبداللہ یوسف، ۲۰۰۳ء، ص۹۱؛ میور، رمزے (Muir, Ramsay)، ۱۹۷۸ء، ص۱۵۱-۱۵۲؛ اکرام، ایس-ایم، ۱۹۶۱ء، ص۴۱۰۔

۳۔ علی، عبداللہ یوسف، ۲۰۰۳ء، ص۹۱؛ اکرام، ۱۹۶۱ء، ص۴۱۰۔

۴۔ احمد، عزیز، ۱۹۹۷ء، ص۳۶-۳۹۔

۵۔ علی، عبداللہ یوسف، ۲۰۰۳ء، ص۸۲؛ حسن، سبط، ۲۰۰۲ء، ۱۱۹-۱۲۱۔

۶۔ علی، عبداللہ یوسف، ۲۰۰۳ء،ص ۱۰۳-۱۰۴،۱۳۰؛ نظامی، خلیق احمد، ۱۹۷۱ء، ص۱۲؛ حسن، سبط، ۲۰۰۲ء، ص۱۲۱؛ پاول، ایورِل این، (Powell, Avril Ann)، ۱۹۹۳ء، ص۷۸-۷۹؛ ملک، اے.آر.، ۱۹۶۱ء، ص۱۶۸-۱۶۹۔

۷۔ دھرماراج، جیکب. ای. (Dharmaraj, Jacob E.) ، ۱۹۹۳ء، ص۵۸؛ والبرج، لنڈا ایس (Walbridge, Linda S.)، ۲۰۰۳ء، ص۱۱؛ باسو، بی.ڈی. (Basu, B.D.)، ص۷۰-۷۱؛ عزیز کے.کے.، ۱۹۷۵ء، ص۳۰۶-۳۰۹۔

۸۔ وارن ہاسٹنگز سے لارڈ منٹو تک کمپنی کی حکومت اسی پالیسی پر کاربند رہی۔ تبلیغِ مسیحیت کے بارے میں لارڈ منٹو کی پالیسی کے بارے میں ملاحظہ ہو: میور، رمزے، ۱۹۷۸ء، ص۲۵۱-۲۵۲۔

۹۔ ایضاً، ص۲۹۶-۲۹۷۔

۱۰۔ پاول(Powell)، ۱۹۹۳ء، ص۷۸-۷۹۔

۱۱۔ خان، سیّد احمد، سر، ۱۹۸۶ء، ص۱۲۲-۱۲۵۔

۱۲۔ قریشی، اشتیاق حسین، ۱۹۸۷ء، ص۲۸۹۔

۱۳۔ رضوی، سیّد محبوب، جنوری-مارچ ۱۹۹۸ء، ''میرٹھ ڈیژن میں مسیحی مشن اور مسلمانوں کا ردّیہ''، ص۴۷؛ خان، سیّد احمد، ۱۹۸۶ء، ص۱۲۴-۱۲۵؛ ملک، اے.آر.، ۱۹۶۱ء، ص۱۹۲۔

۱۴۔ علی، عبداللہ یوسف، ۲۰۰۳ء، ص۱۷۷-۱۷۸؛ سلیم، سیّد محمد، ۱۹۸۵ء، ص۱۷۰-۱۷۳؛ میور، رمزے، ۱۹۷۸ء،ص۲۷۹،۲۹۸-۳۰۱۔

۱۵۔ علی، عبداللہ یوسف، ۲۰۰۳ء، ص۱۷۸؛ سلیم، سیّد محمد، ۱۹۸۵ء، ص۱۷۳-۱۷۴؛ باسو (Basu)، س.ن، ص۵۱-۵۴۔

۱۶۔ سلیم، سیّد محمد، ۱۹۸۵ء، ص۱۷۳-۱۷۴؛ پاول (Powell)، ۱۹۹۳ء، ص۲۰۱۔

۱۷۔ حالی، الطاف حسین، ۲۰۰۴ء، ص۳۶۰؛ ملک، اے.آر.، ۱۹۶۱ء، ص۲۰۳-۲۰۵۔

۱۸۔ صدیقی، عبدالحمید، ۱۹۶۵ء، ص۴۵-۴۶، ۶۹-۷۰؛ باسو (Basu)، ص۱۰۵-۱۰۹؛ عزیز، کے.کے.، ۱۹۷۵ء،

ص۳۰۷-۳۰۸۔

۱۹۔ باسو (Basu)، ص۱۰۵۔

۲۰۔ ہنٹر، ڈبلیو، ڈبلیو، ۱۹۴۶ء، ص۲۵۱، ۲۶۱ وبمواقع عدیدہ؛ قریشی، اشتیاق حسین، ۱۹۸۷ء، ص۲۸۹ خصوصاً حاشیہ۴۶۔

۲۱۔ ہنٹر، ڈبلیو ڈبلیو، ۱۹۴۶ء، ص۲۰۷۔

۲۲۔ پاول (Powell)، ۱۹۹۳ء، ص۱۹۵-۱۹۶،۱۹۹۔ اس سلسلہ میں ڈپٹی عبداللہ آتھم، ڈپٹی مولوی صفدر علی اور مولوی عماد الدّین اور رجب علی وغیرہ بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں جو دولت اور عہدہ و منصب کے لالچ میں عیسائیت قبول کرکے اسلام کے خلاف زہر اگلنے لگے تھے۔ دیکھیے: شہابی، مولانا انتظام اللہ شہابی اکبر آبادیؒ، ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء (دہلی: دینی بکڈپو، س.ن)،ص۳۱؛ اختر راہی، ''سید ناصرالدین ابو المنصور دہلوی اور مسیحی-مسلم مناظراتی ادب''، عالم اسلام اور عیسائیت (اسلام آباد)، ۲:۸ (اگست ۱۹۹۲ء)، ص۵-۸؛ پادری اے ٹھاکر داس، خداوند مسیح کے نو رتن (لاہور: پنجاب رلیجس بک سوسائٹی ۱۹۴۵ء)، ص۱۰-۱۲؛ گارسان دتاسی، مقالاتِ گارسان دُتاسی (دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۴۳ء)، ص۹۷ و بمواقع عدیدہ؛ منشی محمد دین فوق، اخبار نویسوں کے حالات (لاہور: رفاہ عام پریس، ۱۹۱۲)۔

۲۳۔ باسو (Basu)، ص۱۸۴-۲۰۸۔

۲۴۔ دُتاسی، گارسان، ۱۹۷۹ء، ص۲۵۵۔

۲۵۔ ایضاً، ص۳۷۸۔

۲۶۔ خان، سیّد احمد، ۱۹۸۶ء، ص۱۷،۱۲۱-۱۲۳۔

۲۷۔ ایضاً، ص۱۲۳-۱۲۵۔

۲۸۔ قریشی، اشتیاق حسین، ۱۹۸۷ء، ص ۲۷۷-۲۷۸؛ ہنٹر، ۱۹۴۶ء، ص۲۴۲-۲۴۵؛ ہارڈی، پی (Hardy, P.) ، ۱۹۷۲ء، ص۳۷-۳۸۔

۲۹۔ خان، سیّد احمد، ۱۹۸۶ء، ص۱۲۶-۱۲۷۔

۳۰۔ دہلوی، شاہ عبدالعزیز محدّث، ۱۳۴۱ھ، ص۱۸۵-۱۸۶؛ ہنٹر، ۱۹۴۶ء، ص۲۵۵-۲۵۶۔

۳۱۔ دہلوی، شاہ عبدالعزیز محدّث، ۱۳۲۲ھ، ج۱، ص۱۴۱-۱۴۶؛ دہلوی، شاہ عبدالعزیز، ۱۹۶۰ء، ص۲۱۴-۲۱۵، ۲۲۵-۲۲۷،۲۴۹۔

۳۲۔ ایضاً، ۱۹۶۰ء، ص۲۲۵؛ ڈار، ثریّا، ۱۹۹۱ء، ص۱۷۸۔

۳۳۔ مٹکاف خاندان کے افراد دہلی میں مجسٹریٹ، ریذیڈنٹ اور آثارِ قدیمہ کے محکمہ میں افسر تھے۔ ملاحظہ ہو: خان، سیّد احمد، سر، ۱۹۹۰ء، ج۱، ص۱۵۴۔

۳۴۔ دہلوی، شاہ عبدالعزیز، ۱۹۶۰ء، ص۲۱۴-۲۱۵؛ ڈار، ثریّا، ۱۹۹۱ء، ص۱۲۹؛ دیکھیے مسعود، محمد خالد،

اکتوبر-دسمبر ۲۰۰۵ء، ''شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی''، ص ۵۷۔

۳۵۔ گیلانی، سیّد مناظر احسن، ''ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیّت''، ج ۲،ص ۴۱۔

۳۶۔ صدیقی، افتخار احمد، ۱۹۷۱ء، ص ۵۴۔

۳۷۔ خیر آبادی، محمد فضل حق، ۱۳۹۴ھ/۱۹۷۴ء، ص ۲۵۳-۲۵۶؛ خان، سیّد احمد، سر، ۱۹۸۶ء، ص ۱۲۲-۱۲۳۔

۳۸۔ ندوی، سیّد ابوالحسن علی، ''مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور اُن کی تصنیف 'اظہار الحق'''، ص ۵-۱۳؛ ظفر، محمود احمد، حکیم، ۱۴۲۸ھ/ ۲۰۰۷ء، ص ۱۶۷-۳۴۲۔

۳۹۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: شہابی، انتظام اللہ، مفتی، ''مشاہیرِ جنگِ آزادی''، ص ۱۳۹-۱۴۰؛ وہی مصنّف، 'ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء''، ص ۲۸-۳۰؛ ندوی، سیّد سلیمان، ۲۰۰۶ء، ''دیباچہ''،ص ۱۵؛ پاول (Powell)، ۱۹۹۳ء، ص ۲۳۴-۲۳۸۔

۴۰۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: صابری، امداد، ۱۹۷۹ء، ص ۱۹۸،۲۱۴-۲۳۰؛ شہابی، ''ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء''، ص ۱۰،۳۰-۳۲؛ وہی مصنّف، ''مشاہیرِ جنگِ آزادی''، ۱۴۲-۱۴۶؛ سلیم، سیّد محمد، ۱۹۹۳ء، ص ۸۳-۸۴؛ عبداللہ، محمد، ۲۰۰۲ء؛ اسیر ادروی، مولانا، ۲۰۰۴ء؛ پاول (Powell)، ۱۹۹۳ء، ص ۲۴۰-۲۵۵۔

۴۱۔ ردِّعیسائیت اور تبلیغِ اسلام کے باب میں مولانا سید ابوالمنصور دہلوی کی خدمات کے جائزہ کے لیے ملاحظہ ہو: دہلوی، بشیر الدّین احمد، ۲۰۰۱ء، ج ۲، ص ۴۱۶-۴۱۹؛ راہی، اختر، ''سیّد ناصر الدّین ابو المنصور دہلوی اور مسیحی-مسلم مناظراتی ادب''، ص ۵-۱۴۔

۴۲۔ کاندھلوی، نورالحسن راشد، ۱۴۲۱ھ/۲۰۰۰ء، ''قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی''، ص ۲۰۹؛ دہلوی، بشیر الدّین احمد، ۲۰۰۱ء، ج ۲، ص ۴۱۷؛ گیلانی، سیّد مناظر احسن، ''ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت''، ج ۲،ص ۳۹۔

۴۳۔ حالؔی، ۲۰۰۴ء، ص ۳۴۹۔

۴۴۔ ایضاً، ص ۳۵۱، ۳۹۸-۴۰۱۔

۴۵۔ خان، سیّد احمد، سر، ۲۰۰۵ء، ص ۱۹۴-۱۹۶؛ حالؔی، ۲۰۰۴ء، ص ۲۳۵۔

۴۶۔ خان، سیّد احمد، سر؛ ۱۹۰۰ء، ص ۴۹۰؛ وہی مصنف، ۲۰۰۵ء، ص ۱۹۶۔

۴۷۔ حالؔی، ۲۰۰۴ء، ص ۴۰۱۔

۴۸۔ ایضاً، ص ۳۹۸۔

۴۹۔ ایضاً، ص ۳۶۰۔

۵۰۔ لیلی ویلڈ، ڈیوڈ (Lelyveld, David)، ۱۹۹۱ء، ص ۲۰۵-۲۰۷۔

۵۱۔ ایضاً، ص ۲۰۷۔

۵۲۔ حالؔی، ۲۰۰۴ء، ص ۳۹۶، ۳۹۹۔

۵۳۔ ایضاً، ص۳۸۲-۳۸۴، ۳۹۶-۳۹۹ وبمواقع عدیدہ۔
۵۴۔ جین، ایم.ایس (Jain, M.S.)، ۱۹۷۹ء، ص۶۷-۷۰، ۱۶۸-۱۷۰۔
۵۵۔ ندوی، سیّد ابوالحسن، ۱۹۸۱ء، ص۹۵-۹۶۔
۵۶۔ ایضاً، ص۱۰۱-۱۰۲۔
۵۷۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: خیر آبادی، محمد فضل حق، مولانا، ۱۳۹۴ھ/۱۹۷۴ء، ص۲۶۶-۲۷۲؛ منگلوری، سیّد طفیل احمد، ۲۰۰۱ء، ص۸۰-۸۲؛ مہر، غلام رسول، ''پاک و ہند کی پہلی جنگ آزادی''، ص۲۱۶-۲۴۸؛ رضوی، سیّد خورشید مصطفیٰ، ۲۰۰۷ء، بمواقع عدیدہ؛ ہارڈی (Hardy)، ۱۹۷۲ء، ص۱۷-۷۷؛ الحق، سیّد معین، ۱۹۶۸ء، ص۲۳۱-۲۳۸۔
۵۸۔ گیلانی، سیّد مناظر احسن، مولانا، ''سوانح قاسمی''، ج۲،ص۲۸۱-۲۸۲۔
۵۹۔ روبنسن، فرانسس (Robinson, Francis)، ۲۰۰۱ء، ص۱۹۰۔
۶۰۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: عنایت اللہ، محمد ۱۹۲۸ء، ص۹۹؛ روبنسن (Robinson)، ۲۰۰۱ء، ص۱۹۸-۱۹۹۔
۶۱۔ غازی محمود احمد، ۲۰۰۷ء، ص۵-۶۔
۶۲۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: احمد، قیام الدّین، ۱۹۷۶ء، ص۲۶۴-۲۶۷، ۲۸۱-۲۸۶۔
۶۳۔ قادری، محمد ایوب، ۱۹۶۲ء، ''دیباچہ''، ص۴۳۔
۶۴۔ تھانیسری، محمد جعفر، مولانا، ۱۹۶۲ء، ص۱۷۵-۱۷۶۔
۶۵۔ دہلوی، سیّد محمد نذیر حسین محدّث، مولانا، ''فتاوٰی نذیریہ''، ج۲،ص۸۵۰۔
۶۶۔ بہاری، فضل حسین، مولانا، ۱۹۸۴ء، ص۲۰۶۔
۶۷۔ رضوی، سیّد محبوب، ۱۴۲۶ھ/۲۰۰۵ء، ج۱، ص۱۵۰-۱۵۱، ۵۵۱؛ اختر، سفیر، ۲۰۰۳ء، ص۹۔
۶۸۔ فاروقی، ضیاء الحسن، ۱۹۶۳ء، ص۲۸-۲۹؛ مٹکاف، باربرا ڈی. (Metcalf, Barbara D.)، ۲۰۰۲ء، ص۱۰۲۔ دارالعلوم دیوبند میں رائج نصاب کی تفصیل کے لیے دیکھیے: ندوی، سیّد سلمان حسینی، ۲۰۰۴ء، ص۱۲۴، ۱۳۱۔
۶۹۔ گیلانی، ''سوانح قاسمی''، ج۲، ص۲۷۹-۲۸۰؛ جالندھری، رشید احمد، ۲۰۰۴ء، ج۱، ص۱۰۲، ۱۱۸-۱۱۹؛ مٹکاف (Metcalf)، ۲۰۰۲ء، ص۱۰۲؛ فاروقی، ۱۹۶۳ء، ص۲۸-۲۹، ۴۴-۴۵۔
۷۰۔ گیلانی، ''سوانح قاسمی''، ج۲،ص۲۸۱۔
۷۱۔ ایضاً، ج۲،ص۲۸۲۔
۷۲۔ گیلانی، ''ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت''، ج۲،ص۴۰۔
۷۳۔ ایضاً، ج۲،ص۴۰؛ گیلانی، ''سوانح قاسمی''، ج۲،ص۲۹۹-۳۰۰۔
۷۴۔ گیلانی، ''سوانح قاسمی''، ج۲،ص۳۰۰۔
۷۵۔ گنگوہی، رشید احمد، مولانا، ۱۹۹۲ء، ص۴۷۰۔

۷۶۔ سندھی، عبیداللہ، مولانا، ۲۰۰۵، ص۴۱۳-۴۱۴۔
۷۷۔ گیلانی، ''سوانح قاسمی''، ج۲،ص۲۸۱۔
۷۸۔ میاں، سیّد محمد، مولانا، ''علماءِ حق''، ص۱۳۱؛ گیلانی، ''سوانح قاسمی''، ج۲،ص۲۹۴-۲۹۵۔
۷۹۔ میاں، سیّد محمد، مولانا، ''علماءِ حق''، ص۱۳۱۔
۸۰۔ گیلانی، ''سوانح قاسمی''، ج۲، ص۲۹۶۔
۸۱۔ ایضاً، ج۲، ص۲۹۳۔
۸۲۔ ندوی، سیّد ابوالحسن علی، ۱۹۸۱ء، ص۸۸۔
۸۳۔ شاہجہان پوری، ابو سلمان، ۱۹۸۸ء، ص۱۹۱؛ میاں، سیّد محمد، ''علماءِ حق''، ص۲۱۴۔
۸۴۔ رضوی، سیّد محبوب، ۱۴۲۶ھ/ ۲۰۰۵ء، ج۱، ص۲۰۸۔
۸۵۔ تھانوی، محمد اشرف علی، مولانا، ۱۴۲۸ھ، ج۶، ص۱۵۷-۱۵۸، محرّرہ ۲۵ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۲ھ۔
۸۶۔ ایضاً، ج۶، ص۱۸۵-۱۸۶۔ علی گڑھ میں قیام، سرسید احمد خان کے خیالات سے تأثر پذیری نیز علمی و تعلیمی سرگرمیوں کے بارے میں تفصیل کے لیے دیکھیے: اکرام، ۱۹۹۴ء، ص۲۸-۱۲۵۔
۸۷۔ الہ آبادی، سیّد محمد غیاث الدّین، مولانا، ۱۴۲۶ھ/ ۲۰۰۵ء، ص۲۷۸-۲۸۴۔
۸۸۔ ندوی، سیّد سلیمان، ۲۰۰۶ء، ص۳۰۸، حاشیہ۱؛ اثری، ابوعلی، ۱۹۸۶ء، ص۱۹۵-۱۹۶؛ بہاری، فضل حسین، ۱۹۸۴ء، ص۳۴۲۔ سید سلیمان ندوی اپنی ایک تحریر میں فرماتے ہیں: ''مولانا سید نذیر حسین کی درس گاہ سے جو نامور اُٹھے ان میں سے ایک مولانا ابراہیم آروی تھے جنہوں نے سب سے پہلے عربی تعلیم اور عربی مدارس میں اصلاح کا خیال قائم کیا اور مدرسہ احمدیہ کی بنیاد ڈالی۔ بحوالہ الفلاح، محمد عبدہ، مفتی، ''شیخ الکل سید نذیر حسین دہلوی''، ص۱۱۱-۱۱۲۔
۸۹۔ نوشہروی، ابو یحیٰ امام خان، ''تراجم علمائے حدیث ہند''، ص۴۶۱؛ اثری، ابوعلی، ۱۹۸۶ء، ص۱۹۵-۱۹۶۔
۹۰۔ ندوی، سیّد ابوالحسن علی، ''حیاتِ عبدالحی''، ص۱۴۲-۱۴۳؛ الحسنی، سیّد محمد، ۱۹۸۴ء، ص۱۱۶-۱۱۷، ۱۱۹، ۱۲۵؛ احمد، عزیز، ۱۹۶۹ء، ص۵۹؛ مٹکاف، ۲۰۰۲ء، ص۳۳۸-۳۳۹۔
۹۱۔ نعمانی، شبلی، ۱۹۸۹ء، ص۸۰۔
۹۲۔ الحسنی، محمد، ۱۹۸۴ء، ص۱۵۵، ۱۵۸-۱۵۹۔
۹۳۔ ایضاً، ص۱۵۷۔
۹۴۔ ایضاً، ص۱۹۱۔
۹۵۔ ایضاً، ص۱۹۴-۱۹۵۔
۹۶۔ ایضاً، ص۱۹۵-۱۹۶۔
۹۷۔ مٹکاف (Metcalf)، ۲۰۰۲ء، ص۳۴۴؛ زمان، محمد قاسم، ۲۰۰۴ء، ص۷۲۔

۹۸۔ ندوی، سیّد سلمان حسینی، ۲۰۰۴ء، ص۱۲۳، ۱۲۴-۱۴۴، ۱۹۹-۲۳۳۔

۹۹۔ الحسنی، محمد، ۱۹۸۴ء، ص۲۹۵۔

۱۰۰۔ ندوی، سیّد سلیمان، ۲۰۰۶ء، ''دیباچہ''، ص۱۹-۲۰، مزید دیکھیے: ص۱۳۱۔ دینی مدارس کے نصابات کی تدوین نو نیز دینی مدارس میں انگریزی زبان کی تدریس کے بارے میں علامہ شبلی نعمانی کے آراء و خیالات کے جائزہ کے لیے دیکھیے: ضیاء الدین اصلاحی، مسلمانوں کی تعلیم (اعظم گڑھ: دارالمصنفین، ۲۰۰۶ء)، ص۱۳۰-۱۸۲۔ مزید دیکھیے: زمان، ۲۰۰۴ء، ص۶۹-۷۳؛ اکرام، ۱۹۹۴ء، ۲۸۲-۳۱۳۔

۱۰۱۔ ندوی، سیّد سلیمان، ۲۰۰۶ء، ص۱۳۹-۱۴۰، ۱۴۴۔

۱۰۲۔ ایضاً، ص۱۴۴۔

۱۰۳۔ ایضاً، ص۱۳۳-۱۳۴۔

۱۰۴۔ ایضاً، ''دیباچہ''، ص۱۹-۲۰۔

۱۰۵۔ ایضاً، ص۳۷؛ ندوی، شاہ معین الدّین احمد، ''حیاتِ سلیمان''، ص۳۷-۳۸ ؛ آزاد، ابوالکلام، مولانا، ۲۰۰۳ء، ص۳۵۵۔

۱۰۶۔ نعمانی، شبلی، ۱۹۸۹ء، ص۸۸-۸۹۔

۱۰۷۔ ایضاً، ص۸۶۔

۱۰۸۔ ندوی، سیّد سلیمان، ۲۰۰۶ء، ''دیباچہ''، ص۲۰-۲۱۔

۱۰۹۔ ایضاً، ص۱۳۵۔

۱۱۰۔ ایضاً، ص۴۱۶۔

۱۱۱۔ ایضاً، ۳۴۷، ۴۱۶، ۷۶۵۔

۱۱۲۔ ایضاً، ص۱۳۵۔

۱۱۳۔ ایضاً، ص۴۱۸۔

۱۱۴۔ ایضاً، ص۴۱۸-۴۲۰۔

۱۱۵۔ مجیب، ایم.، ۱۹۶۷ء، ص۵۲۳۔

۱۱۶۔ ندوی، سیّد ابوالحسن علی، ''حیات عبدالحی''، ص۳۵۱-۳۶۰، ۳۶۷-۳۶۸، ۳۷۰۔

۱۱۷۔ ندوی، سید سلیمان، ۱۹۵۴ء، ص۹۰-۹۱، حاشیہ۱۔

۱۱۸۔ روبنسن (Robinson)، ۲۰۰۱ء، ص۱۲۳۔

۱۱۹۔ عبدالحی، ابو الحسنات محمد، مولانا، ۱۹۶۴ء، ص۵۵۹، ۵۷۱-۵۷۲۔

۱۲۰۔ روبنسن، ۲۰۰۱ء، ص۱۲۳۔

۱۲۱۔ ندوی، سید سلیمان، ۲۰۰۳ء، ص۵۷۔

۱۲۲۔ ''بارہویں سالانہ رپورٹ مدرسۂ عالیہ نظامیہ، فرنگی محل-لکھنؤ''، بحوالہ روبنسن، ۲۰۰۱ء، ص۱۲۴-۱۲۵۔
۱۲۳۔ عنایت اللہ، محمد، ۱۹۲۸ء، ص۱۱۰؛ عقیل، ۱۹۹۲ء، ص۸۲-۸۳۔
۱۲۴۔ روبنسن (Robinson)، ۲۰۰۱ء، ص۱۲۵-۱۲۶۔
۱۲۵۔ ایضاً، ص۱۲۶۔
۱۲۶۔ ایضاً، ص۱۲۸۔
۱۲۷۔ ایضاً، ص۱۲۸۔
۱۲۸۔ ایضاً، ص۱۲۸-۱۲۹۔

فہرستِ اسنادِ محوّلہ

آزاد، ابوالکلام، مولانا، ۲۰۰۳ء، ''خطوطِ آزاد''، مرتّبہ مالک رام، بُک ٹاک، لاہور۔
اثری، ابوعلی، ۱۹۸۶ء، ''سیّد سلیمان ندوی''، دائرۃُ المعارف، گوجرانوالہ۔
احمد، عزیز، ۱۹۹۷ء، ''برّصغیر میں اسلامی جدیدیت''، مترجمہ جمیل جالبی، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور۔
۔۔۔۔۔، ۱۹۶۹ء، "An Intellectual History of Islam in India" ایڈنبرا یونیورسٹی پریس، ایڈنبرا۔
احمد، قیام الدّین، ۱۹۷۶ء، ''ہندوستان میں وہابی تحریک''، مترجمہ محمد مسلم عظیم آبادی، نفیس اکیڈمی، کراچی۔
اختر، سفیر، ۲۰۰۳ء، ''علماءِ دیوبند اور مطالعۂ مسیحیت''، دارالمعارف، لوھسر شرقو، واہ کینٹ۔
اسیر ادروی، مولانا، ۲۰۰۴ء، ''مجاہد اسلام مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور اُن کے ایمان افروز علمی معرکے''، فرید بک ڈپو، دہلی۔
اصلاحی، ضیاء الدّین، ۲۰۰۶ء، ''مسلمانوں کی تعلیم''، دارُالمصنّفین، اعظم گڑھ۔
اکرام، ایس ایم، ۱۹۶۱ء، "History of Muslim Civilization in India and Pakistan" سٹاربک ڈپو، لاہور۔
۔۔۔۔۔ ،۔ ۱۹۹۴ء، ''یادگارِ شبلی''، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور۔
الحسنی، سید محمد، ۱۹۸۴ء، ''سیرت مولانا محمد علی مونگیری بانی ندوۃ العلماء''، مجلسِ نشریاتِ اسلام، کراچی۔
۔۔۔۔۔، سیّد عبدالحی، ۱۳۹۶ھ/ ۱۹۷۶ء، ''نُزھۃ الخواطر و بھجۃ المسامع والنواظر''، نور محمد-اصح المطابع- کارخانہ تجارت کُتب، کراچی۔
الفلاح، محمد عبدہ، مولانا، جمادی الآخرہ ۱۴۱۷ھ/ اکتوبر ۱۹۹۶ء، ''شیخ الکل سیّد نذیر حسین دہلوی، ۱۲۲۰-۱۳۲۰ھ/ ۱۸۰۵-۱۹۰۲ء''، مشمولہ ''محدّث'' (لاہور)، ۹:۲۷، ص۹۱-۱۴۶۔

الہ آبادی، سیّد محمد غیاث الدّین، مولانا، ۱۴۲۶ھ/ ۲۰۰۵ء، ''سوانح مسیح الامّت''، جامعہ مفتاح العلوم، جلال آباد-مظفر نگر۔

باسو، بی-ڈی، میجر (Basu, B.D. Major)، س.ن، "History of Education Under the Rule of East India Company"، آر.چیٹرجی، کلکتہ۔

بہاری، فضل حسین، مولانا، ۱۹۸۴ء، ''الحیاۃ والمماۃ، سوانح حیات حضرت الامام سیّد محمد نذیر حسین محدّث دہلوی''، المکتبۃ الاثریہ، سانگلہ ہل، شیخوپورہ۔

پاول، ایورِل این (Powell, Avril Ann)، ۱۹۹۳ء، "Muslims and Missionaries in Pre-Mutiny India"، کرزن پریس، سرے (Surrey)، یو-کے۔

تھانوی، محمد اشرف علی، مولانا، ۱۴۲۸ھ، ''امداد الفتاوٰی''، مرتبہ مولانا مفتی محمد شفیع، مکتبۂ درالعلوم، کراچی۔

تھانیسری، محمد جعفر، مولوی، ۱۹۶۲ء، ''تواریخِ عجائب یعنی کالا پانی''، مرتبہ محمد ایوب قادری، سلمان اکیڈمی، کراچی۔

جالندھری، رشید احمد، ۲۰۰۴ء، ''برطانوی ہند میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم: ایک ناقدانہ جائزہ (ج۱، دارالعلوم دیوبند)''، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور۔

جین، ایم.ایس (Jain, M.S.) ، ۱۹۷۹ء، "The Aligarh Movement: Its Origin and Development, 1858-1906" کریم سنز، کراچی۔

حالؔی، الطاف حسین، ۲۰۰۴ء، ''حیاتِ جاوید''، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔

حسن، سبط، ۲۰۰۲ء، ''نویدِ فکر''، مکتبۂ دانیال، کراچی۔

خان، سیّد احمد، سر، ۱۹۰۰ء، ''مکمل مجموعہ لیکچرز و اسپیچز سرسیّد''، مرتبہ محمد امام الدّین گجراتی، مصطفائی پریس، لاہور۔

خان، سیّد احمد، سر، ۱۹۹۰ء، ''آثار الصّنادید''، مرتبہ خلیق انجم، اردو اکادمی، دلی۔

خان، سیّد احمد، سر، ۲۰۰۵ء، ''خود نوشت افکارِ سرسیّد''، مرتبہ ضیاء الدّین لاہوری، جمعیّت پبلی کیشنز، لاہور۔

خان، سیّد احمد، سر، ۱۹۷۶ء، ''اسبابِ بغاوتِ ہند''، اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی۔

خیر آبادی، فضل حق، ۱۳۹۴ھ/ ۱۹۹۷ء، ''باغی ہندوستان'' (اردو ترجمہ 'الثّورۃ الھندیۃ')، مترجمہ عبدالشاہد خان شروانی، مکتبۂ قادریہ، لاہور۔

دہلوی، سیّد محمد نذیر حسین، س.ن.، ''فتاوٰی نذیریہ''، دلی پرنٹنگ پریس، دہلی۔

دہلوی، شاہ عبدالعزیز محدّث، ۱۹۶۰ء، ''ملفوظاتِ شاہ عبدالعزیز''، مترجمہ و مرتبہ مولوی محمد علی لطفی و مفتی انتظام اللہ شہابی، پاکستان ایجوکیشنل پبلشرز، کراچی۔

دہلوی، شاہ عبدالعزیز محدّث، ۱۳۴۱ھ، ''فتاوٰی عزیزی''، مطبع مجتبائی، دہلی۔

دھرماراج، جیکب ای (Dharmaraj, Jacob E.)، ۱۹۹۳ء، "Colonialism and Christian Mission: Postcolonial Reflections"، انڈین سوسائٹی فار پروموٹنگ کرسچن ، نالج، دہلی۔

د تاسی، گارسان، ۱۹۴۳ء، ''مقالاتِ گارسان د تاسی''، انجمنِ ترقی اردو ہند، دہلی۔

د تاسی، گارسان، ۱۹۷۹ء، ''خطباتِ گارسان د تاسی''، مترجمہ محمد حمیداللہ و دیگر، انجمنِ ترقی اردو پاکستان، کراچی۔

ڈار، ثریّا، ۱۹۹۱ء، ''شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی اور اُن کی علمی خدمات''، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور۔

راہی، اختر، اگست ۱۹۹۲ء، ''سیّد ناصرالدّین ابو المنصور دہلوی اور مسیحی-مسلم مناظراتی ادب''، مشمولہ ''عالمِ اسلام اور عیسائیت'' (اسلام آباد)، ۲:۸، ص۵-۱۴۔

رضوی، سیّد خورشید مصطفیٰ، ۲۰۰۷ء، ''تاریخ جنگِ آزادیٔ ہند''، یو پبلشرز، لاہور۔

رضوی، سیّد محبوب، جنوری-مارچ ۱۹۹۸ء، ''میرٹھ ڈویژن میں مسیحی مشن اور مسلمانوں کا ردّیہ''، مشمولہ ''عالمِ اسلام اور عیسائیت (اسلام آباد)، ۸:۱، ص۷۰-۷۸۔

رضوی، سیّد محبوب، ۱۴۲۶ھ/۲۰۰۵ء، ''تاریخ دارالعلوم دیوبند''، ادارۂ اسلامیات، لاہور۔

روبنسن، فرانسس (Robinson, Francis)، ۲۰۰۱ء، "The 'Ulama of Farangi Mahall and Islamic Culture in South Asia" سی ہرسٹ اینڈ کمپنی، لنڈن۔

زمان، محمد قاسم، ۲۰۰۴ء، "The Ulama in Contemporary Islam: Custodians of Change" آکسفرڈ یونیورسٹی پریس، کراچی۔

سلیم، سیّد محمد، ۱۹۹۳ء، ''مغربی زبانوں کے ماہر علماء''، ادارۂ تعلیمی تحقیق، لاہور۔

سلیم، سیّد محمد، ۱۹۸۵ء، ''مسلمان اور مغربی تعلیم پاک و ہند میں''، ادارۂ تعلیمی تحقیق، لاہور۔

سندھی، عبیداللہ، مولانا، ۲۰۰۵ء، ''افادات و ملفوظاتِ امام عبیداللہ سندھی''، مرتّبہ محمد سرور، سندھ ساگر اکادمی، لاہور۔

شاہ جہان پوری، ابو سلمان، ۱۹۸۸ء، ''شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی-ایک سیاسی مطالعہ مع سیاسی خُطبات و فتاوٰی اور خطوط و پیغامات''، مجلسِ یادگارِ شیخ الاسلام، کراچی۔

شہابی، انتظام اللہ، مفتی، س.ن.، ''ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء''، دینی بک ڈپو، دہلی۔

شہابی، انتظام اللہ، مفتی، س.ن.، ''مشاہیرِ جنگِ آزادی، ۱۸۵۶ء تا ۱۹۵۷ء''، محمد سعید اینڈ سنز، کراچی۔

صابری، امداد، ۱۹۷۹ء، ''فرنگیوں کا جال''، کوہ نُور پریس، دہلی۔

صدیقی، افتخار احمد، ۱۹۷۱ء، ''مولوی نذیر احمد دہلوی- احوال و آثار''، مجلسِ ترقی ادب، لاہور۔

صدیقی، عبدالحمید، ۱۹۶۵ء، ''میکالے کا نظریۂ تعلیم''، روہیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی، کراچی۔

ظفر، حکیم محمود احمد، ۱۴۲۸ھ/۲۰۰۷ء، ''مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور اُن کے معاصرین''، تخلیقات، لاہور۔

عبدالحی، ابو الحسنات محمد، مولانا، ۱۹۶۴ء، ''مجموعہ فتاوٰی مولانا عبدالحی''، مترجمہ مولانا خورشید عالم، محمد سعید اینڈ سنز، کراچی۔

عبدالحی، ابوالحسنات محمد، مولانا، ۱۹۶۴ء، ''مجموعہ فتاوٰی مولانا عبدالحی''، محمد سعید اینڈ سنز، کراچی۔

عبداللہ، محمد، ۲۰۰۲ء، ''مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور اُن کی دینی وعلمی خدمات''، مقالہ برائے پی.ایچ.ڈی. علومِ اسلامیہ، کلیۂ علوم اسلامیہ و شرقیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔

عزیز کے.کے.، ۱۹۷۵ء، "The British in India: A Study in Imperialism"، قومی کمیشن برائے تحقیقِ تاریخ و ثقافت، اسلام آباد۔

عقیل، معین الدّین، ڈاکٹر، ۱۹۹۲ء، ''تحریکِ پاکستان کا تعلیمی پسِ منظر''، ادارۂ تعلیمی تحقیقی، لاہور۔

علی، عبداللہ یوسف، ۲۰۰۳ء، ''انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدّن کی تاریخ''، دوست ایسوسی ایٹس، لاہور۔

عنایت اللہ، محمد، ۱۹۲۸ء، ''تذکرۂ علمائے فرنگی محل''، لکھنؤ۔

غازی، محمود احمد، ۲۰۰۷ء، ''مغرب کا فکری و تہذیبی چیلنج اور علماء کی ذمّہ داریاں''، الشریعہ اکادمی، گوجرانوالہ۔

فاروقی، ضیاء الحسن، ۱۹۶۳ء، "The Deoband School and the Demand for Pakistan"، ایشیا پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔

فیضی، آصف اے.اے.، ۱۹۵۵ء، "Outlines of Muhammadan Law" آکسفرڈ یونیورسٹی پریس، لنڈن۔

قادری، محمد ایوب، ۱۹۶۲ء، ''مقدمہ''، مشمولہ مولوی محمد جعفر تھانیسری، ''تواریخِ عجائب یعنی کالا پانی''، سلمان اکیڈمی، کراچی۔

قریشی، اشتیاق حسین، ۱۹۸۷ء، ''برّعظیم پاک و ہند کی ملّتِ اسلامیہ''، مترجمہ ہلال احمد زبیری، شعبۂ تصنیف و تالیف وترجمہ، کراچی یونیورسٹی، کراچی۔

کاندھلوی، نور الحسن راشد، ۱۴۲۱ھ/۲۰۰۰ء، ''قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی''، صحیفۂ نور-خصوصی اشاعت (کاندھلہ، مظفر نگر)، شمارہ نمبرا۔

گنگوہی، رشید احمد، مولانا، ۱۹۹۲ء، ''تالیفاتِ رشیدیہ''، ادارۂ اسلامیات، لاہور۔

گیلانی، سیّد مناظر احسن، س.ن، ''ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت''، ندوۃُ المصنّفین، دہلی۔

گیلانی، سیّد مناظر احسن، س.ن.، ''سوانح قاسمی''، مکتبۂ رحمانیہ، لاہور۔

لیلی ویلڈ، ڈیوڈ (Lelyveld, David)، ۱۹۹۱ء، "Aligarh's First Generation: Muslim Solidarity in British India"، بُک ٹریڈرز، لاہور۔

مٹکاف، ڈی. باربرا (Metcalf, Barbara D.)، ۲۰۰۲ء، "Islamic Revival in British India,

"1860-1900 آکسفرڈ یونیورسٹی پریس، نئی دہلی۔
مجیب، ایم، ۱۹۶۷ء، "The Indian Muslims" جارج ایلن اینڈ اَن وِن، لنڈن۔
مسرا، بی.بی. (Misra, B.B)، ۱۹۵۹ء، "The Central Administration of the East India Company, 1773-1834" مانچسٹر یونیورسٹی پریس، مانچسٹر۔
مسعود، محمد خالد، اکتوبر-دسمبر۲۰۰۵ء، ''شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی، ۱۷۴۶-۱۸۲۴ء''، مشمولہ ''المعارف'' (لاہور)، ۱۷۶:۱۰-۱۲، ص۳۴-۶۳۔
معین الحق، سیّد ، ۱۹۶۸ء، "The Great Revolution of 1857"، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی۔
ملک، اے-آر، ۱۹۶۱ء، "British Policy and the Muslims in Bengal, 1757-1856"، ایشیاٹک سوسائٹی آف پاکستان، ڈھاکہ۔
منگلوری، سیّد طفیل احمد، ۲۰۰۱ء، ''مسلمانوں کا روشن مستقبل''، مکتبۂ محمودیہ، لاہور۔
مہر، غلام رسول، س.ن.، ''پاک و ہند کی پہلی جنگِ آزادی''، غلام علی اینڈ سنز، لاہور۔
میاں، سیّد محمد، س.ن.، ''علماءِ حق''، اسلامی کتاب گھر، دیوبند۔
ندوی، سید ابو الحسن علی، س.ن.، ''حیاتِ عبدالحی''، مجلسِ نشریاتِ اسلام، کراچی۔
ندوی، سیّد ابوالحسن علی، جولائی۱۹۹۳ء، ''مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور اُن کی تالیف 'اظہار الحق' ''، مترجمہ عبداللہ عباس ندوی، مشمولہ ''عالم اسلام اور عیسائیت'' (اسلام آباد)، ۳:۷، ص۵-۱۳۔
ندوی، سیّد ابوالحسن علی، ۱۹۸۱ء، ''مسلم ممالک میں اسلامیّت اور مغربیّت کی کشمکش''، مجلس نشریاتِ اسلام، کراچی۔
ندوی، سیّد سلمان حسینی، ۲۰۰۴ء، ''ہمارا نصابِ تعلیم کیا ہو؟''، مجلسِ نشریاتِ اسلام، کراچی۔
ندوی، سیّد سلیمان، ۲۰۰۳ء، ''یادِ رفتگاں''، مجلسِ نشریاتِ اسلام، کراچی۔
ندوی، سیّد سلیمان، ۲۰۰۳ء، ''یادِ رفتگاں''، مجلسِ نشریاتِ اسلام، کراچی۔
ندوی، سیّد سلیمان، ۱۹۵۴ء، ''مکاتیبِ سیّد سلیمان ندوی''، مرتّبہ مولانا مسعود عالم ندوی، مکتبۂ چراغِ راہ، لاہور۔
ندوی، سیّد سلیمان، ۲۰۰۶ء، ''حیاتِ شبلی''، دارُ المصنّفین، اعظم گڑھ۔
ندوی، شاہ مُعینُ الدّین احمد، س.ن.، ''حیاتِ سلیمان''، دارُالمصنّفین، اعظم گڑھ۔
ندوی، محمد اسحاق وشمس تبریز خان، ۱۹۸۳-۱۹۸۴ء، ''تاریخ ندوۃ العلماء''، ۲ جلدیں، نظامتِ ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔
نعمانی، شبلی، ۱۹۸۹ء، ''خطباتِ شبلی''، نیشنل بک فاؤنڈیشن، لاہور۔
والبرج، لِنڈا ایس (Walbridge, Linda S.)، ۲۰۰۳ء، The Christians of Pakistan: The Passion of "Bishop John Joseph"، رَوٹ لج کرزن، لندن۔
ہارڈی، پی، ۱۹۷۲ء، "The Muslims of British India"، کیمبرج یونیورسٹی پریس، کیمبرج۔
ھنٹر، ڈبلیو. ڈبلیو، ۱۹۴۶ء، ''ہمارے ہندوستانی مسلمان''، مترجمہ صادق حسین، اقبال اکیڈمی، لاہور۔

Abstract

With the conquest of Delhi by the forces of East India Company, in 1803, the military and political dominance of the British Empire on this region was complete. Now the cultural dominance of the ruling nation was inevitable. After the collapse of the War of Independence of 1857, the 'Ulama's stance towards Western culture, modern education and especially the English language was very hard. However, some of the 'Ulama' realized that to counter the Christian missionary activities, it is inevitable to acquire proficiencey in this language.

Maulana Shibli Nomani who advocated the idea of producing This paper seeks to critically analyze the response of the 'Ulama' of Indo-Pakistan Subcontinent to the English language in its historical perspective. It endeavours to explore the caused of 'Ulama's' indifference towards the modern western education and English language especially their hostile attitude towards the teaching of English in madrassahs would be analyzed. In this paper the fatawa of the 'Ulama' dealing with the question of learning English language would be examined.